سورۃ الانبیاء

نام:

اس سورت کا نام اَلْاَنْبِیَآء ہے اور اس میں 7 رکوع اور 112 آیتیں ہیں۔ لفظ انبیاء اس سورت میں نہیں آتا مگر اس کا مضمون انبیاء علیہم السلام کے متعلق ہی ہے۔ ان پر اعتراضات، ان کا مقام بلند، ان کے مخالفین کی ہلاکت، ان کے دشمنوں کے ہاتھ سے ان کی نجات، ان کا اور ان کے متبعین کا وارث زمین ہونا، انہی باتوں کا اس میں ذکر ہے اور بالخصوص اس میں عصمت انبیاء کا مضمون نہایت صفائی سے بیان ہوا ہے کہ وہ اپنے قول اور فعل دونوں میں کامل طور پر اللہ تعالیٰ کی رضا کی راہوں پر چلتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس کا نام اَلْاَنْبِیَآء ہے۔

خلاصہ مضمون:

① اس سورت کی ابتدا اس سے ہوتی ہے کہ اعمال کی جزا و سزا کی لوگ پروا نہیں کرتے۔ بلکہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک جگانے والا آتا ہے تو اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ کبھی اس کی تعلیم کو پریشان خوابیں کہتے ہیں، کبھی افترا قرار دیتے ہیں، کبھی اسے شاعر بتاتے ہیں۔ ان کا جواب دیا کہ رسول ہمیشہ بشر ہی ہوتے رہے۔

② دوسرے رکوع میں انبیاء کے مقام عظیم کا ذکر کیا کہ گو وہ انسان ہیں، انسانوں کی طرح کھاتے پیتے ہیں، مگر ان کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنا اس سے ظاہر ہے کہ ان کے مخالف اور بدخواہ جب انہیں یا ان کی تعلیم کو نیست و نابود کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں تو آخر خود ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کا طاقتور ہاتھ ان کی تائید میں نہ ہوتا تو یہ ممکن نہ تھا کہ ایک اکیلا انسان ساری طاقتوں کا مقابلہ کر کے غالب آ جاتا۔ اسی رکوع کے دوسرے حصہ میں صاف الفاظ میں بتایا کہ انبیاء کا تعلق اللہ تعالیٰ سے اس قدر ہے کہ ساری دنیا کی مخالفت کے باوجود وہ لذت جو انہیں اس میں حاصل ہوتی ہے وہ ترقی پر ہوتی ہے۔ پھر بتایا کہ یہی لوگ خدا کی توحید کو دنیا میں پھیلاتے ہیں۔ پھر بتایا کہ وہ خدا کے ایسے کامل فرمانبردار ہوتے ہیں کہ نہ قول میں اور نہ فعل میں ان سے کوئی ایسی بات ظاہر ہوتی ہے جو رضائے الٰہی کے خلاف ہو۔

③ تیسرے رکوع میں اول بتایا کہ جس طرح بارش سے زمین کی روئیدگی قوت پکڑتی ہے اسی طرح سے وحی سے قلوب انسانی میں نشوونما پیدا ہوتی ہے اور جو لوگ اس آسمانی بارش سے اپنے آپ کو محروم کر دیتے ہیں وہ ضرور آخر کار نقصان اٹھائیں گے۔

④ چوتھے میں بتایا کہ حق کس طرح دلوں پر تسلط کرتا چلا جاتا ہے اور یہ اس کی آخری کامیابی کا کھلا نشان ہے۔

⑤ پانچویں میں بتایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب تعلیم توحید دی تو کس طرح لوگ ان کے دشمن ہو گئے اور کس طرح انہیں ہلاک

کرنا چاہا مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو بچایا اور آپ کے ذریعہ حق کو دنیا میں پھیلایا۔

⑥ چھٹے رکوع میں کئی ایک دوسرے انبیاء کا ذکر کر کے اس بات کو واضح کیا کہ کس طرح بڑے مصائب میں وہ مبتلا ہو کر آخر بچے اور کامیاب ہوئے۔

⑦ ساتویں میں حضرت خاتم النبیین ﷺ کا ذکر کیا اور بتایا کہ اب بھی اسی طرح حق کامیاب ہوگا اور آخر کار راستباز زمین کے وارث ہوں گے۔

تعلق:

اس سورت کا تعلق پچھلی سورت سے ظاہر ہے۔ اس میں مضمون کا خاتمہ اس بات پر کیا کہ آنحضرت ﷺ دنیا میں ناکام نہیں ہو سکتے اور آخر آپ کی قبولیت پھیلے گی۔ اس میں اسی کو واضح کیا اور بتایا کہ انبیاء اور راستباز ہمیشہ ہی کامیاب ہوتے رہے ہیں اور جو دشمن انہیں تباہ کرنا چاہتے ہیں ان سے انہیں بچا کر آخر کار حق کو غالب کیا جاتا ہے اور انہیں زمین کا وارث بنایا جاتا ہے۔

زمانۂ نزول:

اس سورت کا زمانہ نزول بھی آنحضرت ﷺ کی مکی زندگی کا پہلا حصہ ہے۔ یعنی ہجرت حبش سے پہلے کا زمانہ۔ دیکھو بنی اسرائیل پر نوٹ۔ بنی اسرائیل سے لے کر اس سورت تک اوائل زمانہ کی سورتیں ہیں۔ جیسا کہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی کھلی شہادت وہاں نقل ہو چکی ہے۔

ایاتھا 112 (21) سُوْرَةُ الْاَنْبِيَآءِ مَكِّيَّةٌ (73) رکوعاتھا 7

الْجُزْءُ السَّابِعَ عَشَرَ (17)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝1 — لوگوں کے لیے ان کا وقت حساب قریب آ گیا ہے اور وہ غفلت میں منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ (2126)

مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۝2 — کوئی نئی نصیحت ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس نہیں آتی، مگر وہ اس کو سنتے ہیں حالانکہ وہ کھیل رہے ہوتے ہیں۔ (2127)

2126- حساب کا یا حساب کے وقت کا قریب ہونا کئی طرح پر ہے۔ ایک یہ کہ انسان کا ہر عمل ساتھ ساتھ ہی نتیجہ پیدا کرتا جاتا ہے۔ دوسرا یہ کہ موت پر بھی ایک حساب انسان کے سامنے آ جاتا ہے اور موت کا وقت بھی ہر انسان سے قریب ہے۔ تیسرا یہ کہ اس قوم یا ان لوگوں کے لیے جن میں رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے تھے، ان کا وقت حساب قریب آ گیا تھا۔ کیونکہ ان کے اعمال اس قابل ہوگئے تھے کہ اس دنیا میں ان کو سزا دی جائے، اور رسول کا آنا اتمام حجت کے لیے تھا۔ چوتھا یہ کہ سب لوگوں کا حساب قریب ہے، یعنی قیامت کبریٰ بھی جلد آنے والی ہے [بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ] (صحيح البخاری، كتاب الرقاق، باب قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةَ كَهَاتَيْنِ، حديث: 6504)۔ اور بعض نے تحقق وقوع کے لحاظ سے قرب مراد لیا ہے۔ کیونکہ جو چیز لامحالہ آنے والی ہے وہ قریب ہی ہے۔ (د) اس سورت کی ابتدا اس مضمون سے کہ اعمال کی جزا و سزا یقینی ہے نہایت موزوں ہے۔ اس لیے کہ اس میں بحث ہی نبوت پر ہے، اور ایک بات جس پر انبیاء علیہم السلام خاص زور دیتے ہیں وہ اعمال کی جزا و سزا ہے۔

2127- مُّحْدَثٍ۔ حَدُوْث کے لیے [دیکھو نمبر: 1516د]۔ اور اَحْدَاثٌ کے معنی وجود میں لانا ہیں اور مُحْدَث وہ چیز جو وجود میں لائی جائے بعد اس کے کہ وہ کچھ نہیں تھی۔ اور یہ بعض وقت اس کی اپنی ذات میں ہوتا ہے اور بعض وقت ان لوگوں کے لیے جنہیں یہ حاصل ہوتی ہے۔ (غ)

مُحَدَّث کے لغوی معنی:

مُحَدَّث جو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے لیے حدیث میں آیا ہے اور جس قسم کے لوگوں کا اس امت میں ہونے کا وعدہ دیا گیا ہے اس کے معنی ہیں وہ شخص جس کے دل میں [مَلَاِ اَعْلٰی] کی طرف سے ایک بات ڈالی جائے۔ (غ) اور صادق الظن شخص کو محدث کہتے ہیں۔

لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ اَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَ اَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝۳

ان کے دل غافل ہوتے ہیں، اور جو ظالم ہیں وہ چھپ کر مشورہ کرتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں مگر تمہاری طرح ایک انسان ہے، تو کیا تم جادو کو قبول کرتے ہو، حالانکہ تم دیکھتے ہو۔ (2128)

قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ۫ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۴

کہا میرا رب (ہر ایک) بات کو جانتا ہے (جو) آسمانوں اور زمین میں (کہی جاتی) ہے اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔

بَلْ قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۖ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَاۤ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ۝۵

بلکہ کہتے ہیں (یہ) پریشان خوابیں ہیں بلکہ (یہ کہ) اس نے افترا کیا بلکہ (یہ کہ) وہ شاعر ہے، سو ہمارے پاس کوئی نشان لائے جس طرح (کے نشانوں کے ساتھ) پہلوں کو بھیجا گیا۔ (2129)

اصطلاح شریعت میں محدث اور احادیث میں اس کی تفسیر مُلْهَم سے کی گئی ہے اور اس سے مراد ایسے لوگ ہیں جن کے دل میں ایک بات ڈالی جائے تو وہ دور اندیشی اور فراست سے اس کی خبر دیں۔ گویا ان کے ساتھ ایک بات کی گئی ہے جسے وہ کہہ دیتے ہیں۔ (ل) اور ایک حدیث میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ذکر میں مُحَدَّث کا لفظ آتا ہے اور دوسری حدیث متفق علیہ میں اسی حدیث مُحَدَّثُوْنَ کی جگہ الفاظ [رِجَالٌ يُكَلَّمُونَ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَكُونُوا أَنْبِيَاءَ] (صحيح البخاری، كتاب فضائل الصحابة، باب مَنَاقِبُ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ أَبِي حَفْصٍ الْقُرَشِيِّ الْعَدَوِيِّ رضی الله عنه، حديث: 3689) آتے ہیں۔ جس سے صاف معلوم ہوا کہ مُحَدَّث اصطلاح شریعت میں وہ لوگ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کلام کرتا ہے، مگر وہ نبی نہیں ہوتے۔

2128- **مخالفین کا قرآن کریم کو سحر قرار دینا:** ابتدائی زمانہ کی سورت ہے۔ بڑے معجزات ابھی ظاہر نہیں ہوئے اور قرآن کریم اندر ہی اندر دلوں کو کھینچ رہا ہے۔ یہاں تک کہ سخت ترین تکلیفیں اٹھا کر بھی لوگ اسے قبول کرتے چلے جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے کلام میں یہ اثر ہی تھا جس کی وجہ سے اسے سحر کہتے تھے۔

2129- پہلی بات جو قرآن کریم کے متعلق کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ پریشان خواب ہیں۔ پھر جب اس پر خود مطمئن نہیں ہوتے اور اس کے نظم کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں افترا ہے۔ یہ اس نے خود بات بنا کر کہہ دی ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ محض شاعر ہے یعنی اس کے الفاظ حقیقت سے خالی ہیں۔ قرآن کریم کے مخالف آج بھی ایک بات پر متفق نہیں۔ ایک کچھ کہتا ہے تو دوسرا کچھ۔ پریشان

مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝۶

ان سے پہلے کوئی بستی ایمان نہیں لائی، جسے ہم نے ہلاک کیا تو کیا یہ ایمان لائیں گے؟

وَ مَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۷

اور تجھ سے پہلے ہم نے کسی کو نہیں بھیجا سوائے مَردوں کے جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے، پس اہل علم سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے۔ (2130)

وَ مَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ مَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ۝۸

اور ان کے ہم نے ایسے جسم نہ بنائے تھے کہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ وہ غیر متغیر تھے۔ (2131)

ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَ مَنْ نَّشَآءُ وَ اَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ۝۹

پھر ہم نے (اپنا) وعدہ سچ کر دکھایا، سو انہیں ہم نے نجات دی اور جسے چاہا، اور زیادتی کرنے والوں کو ہم نے ہلاک کر دیا۔ (2132)

خوابوں میں تعلق کوئی نہیں ہوتا۔ وہ کاہنوں کی طرح چند بے معنی فقرے چاہتے ہیں۔ مگر قرآن کریم میں ایک غرض اور مقصد صاف نظر آتا ہے۔ اس لیے بول اٹھتے ہیں کہ یہ بناوٹ ہے۔ پھر محض بناوٹ نہیں، کیونکہ بناوٹ کا اتنا اثر نہیں اس لیے پھر یہ خیال گزرتا ہے کہ یہ شاعرانہ کلام ہے کیونکہ شاعر تخیل کے زور سے کلام میں اثر پیدا کرتا ہے۔

2130- ﴿بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ [3] کا جواب ہے۔ یعنی پہلے بھی انسان آتے رہے اور رسول بشر ہی ہوسکتا ہے تاکہ وہ ان کے لیے نمونہ بنے۔ اگر رسول کسی اور جنس سے ہوتا تو وہ انسانوں کے لیے نمونہ کا کام نہ دے سکتا تھا۔

2131- **وفات مسیح پر فیصلہ کن دلیل:** خُلُود اور خَالِد کے لیے [دیکھو نمبر: 39أ]۔ اس کے اصل معنی فساد واقع ہونے سے بری ہونا ہیں، جو کھانے پینے کا محتاج ہے۔ وہ خَالِد نہیں ہوسکتا یعنی اس کا جسم تغیر سے پاک نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ کھانا بدل ما یتحلل ہے اور انسان کو کھانے کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ اس کے جسم خاکی سے کچھ اجزا ہر وقت نکلتے رہتے ہیں ان کی جگہ دوسرے اجزا لیتے رہتے ہیں، اس لیے وہ کھانے کا محتاج ہوتا ہے۔ اور کچھ اجزا کا نکلنا اور دوسروں کا ان کی جگہ لینا فانی ہونے کی دلیل ہے۔ اور یہاں بتایا ہے کہ رسولوں کا جسم خاکی بھی دوسرے انسانوں کی طرح ہوتا ہے یعنی تغیر اس میں بھی ہوتا رہتا ہے۔ یہ دلیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس جسم خاکی کے ساتھ آسمان پر زندہ ہونے کو جیسا کہ بہت مسلمانوں کا خیال ہے صریحاً باطل ٹھہراتی ہے۔

2132- یہ ان کے اقوال [آیت نمبر: 5] کا جواب ہے، اللہ تعالیٰ کا وعدہ جو مومنوں کی نجات اور مکذبوں کی ہلاکت کے متعلق ہے پورا ہو کر اس خیال کو باطل ٹھہراتا ہے کہ یہ پریشان خوابوں کا نتیجہ سالہا سال کے بعد کیونکر وہی نکل سکتا ہے جو قبل از وقت بتایا جاتا

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۰ ع

ہم نے تمہاری طرف کتاب اتاری ہے جس میں تمہاری بڑائی ہے۔ تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ (2133)

وَ كَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّ اَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝۱۱

اور کتنی بستیاں ہم نے ہلاک کر دیں جو ظالم تھیں اور ان کے بعد ہم نے دوسری قوم کو اٹھا کھڑا کیا۔ (2134)

فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ۝۱۲

پھر جب انہوں نے ہمارے عذاب کی آہٹ پائی، تو اس سے بھاگنے لگے۔ (2135)

ہے۔ ایسا ہی ان وعدوں کے پورا ہونے سے افترا یا بناوٹ ہونے کا خیال بھی باطل ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک مفتری آئندہ کے متعلق کوئی پرزور دعویٰ نہیں کرسکتا۔ بالخصوص جب وہ خود سخت بے سروسامانی کی حالت میں ہو اور چاروں طرف مخالفت کا زور ہو رہا ہو۔ شاعر، سو وہ موزوں کلام بنا سکتا ہے مگر وہ بھی یہ نہیں کرسکتا کہ بڑی بڑی قوموں کا تنہا مقابلہ کرسکے۔

2133- **قرآن کے ذریعہ سے قومیں عظمت حاصل کریں گی:** ذِکْر کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 191] اور یہاں شرف یا بزرگی مراد لیے گئے ہیں۔ (ج) اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی معنی مروی ہیں۔ (ر) مطلب یہ ہے کہ نہ صرف ایمان لانے والوں کے لیے نجات اور مکذبین کے لیے ہلاکت کی خبر ہے۔ بلکہ فی الحقیقت اس کے اندر وہ اعلیٰ درجہ کے جوہر موجود ہیں کہ ان کو عمل میں لا کر ایک قوم دنیا میں عظیم الشان مرتبہ پر پہنچ سکتی ہے اور مومن دنیا میں ایک عظیم الشان قوم بن جائیں گے۔

2134- **انبیاء کے اللہ تعالیٰ سے تعلق کا نشان:** ﴿قَصَمْنَا﴾۔ قَصَمَ کسی چیز کا کوٹنا، سخت چیز کا توڑنا، ہلاک کرنا ہے۔ (ل) ان چند آیات میں بتایا ہے کہ رسول بے شک عام انسانوں کی طرح کھاتا پیتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا تعلق اس سے ظاہر ہے کہ بڑی بڑی ہستیاں اور قومیں جب اس کی مخالفت میں کھڑی ہو جاتی ہیں تو بجائے اس کے کہ اس کا کچھ بگاڑ سکیں خود تباہ ہو جاتی ہیں۔ اگر اس شخص کا تعلق اس مقتدر ہستی سے نہ ہو جس کے قبضہ قدرت میں زمین و آسمان کی سب طاقتیں ہیں تو کس طرح ممکن ہے کہ ایک اکیلے آدمی کے مقابلہ پر اتنی زبردست قومیں ہلاک ہو جائیں۔ رکوع کے پچھلے حصہ میں انبیاء علیہم السلام کے اللہ تعالیٰ سے تعلق کا ذکر ہے۔

2135- یَرْکُضُوْنَ۔ رَکْض کے معنی پیر کے ساتھ مارنا ہیں۔ سوار کی طرف منسوب ہو تو سواری کے دوڑانے پر آتا ہے اور چلنے والے کی طرف ہو تو چلنا مراد ہوتا ہے۔ ﴿اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ﴾ [صٓ: 42:38] ''اپنی ایڑی لگائے چل۔'' اور یہاں مراد انہزام یعنی بھاگنا ہے۔ (غ)

لَا تَرْكُضُوْا وَ ارْجِعُوْۤا اِلٰى مَاۤ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَ مَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ﴿۱۳﴾

بھاگو نہیں اور اس کی طرف لوٹ جاؤ جس میں تم عیش کرتے تھے اور اپنے مکانوں کی طرف تاکہ تم سے سوال کیا جائے۔ (2136)

قَالُوْا يٰوَيْلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴﴾

انہوں نے کہا ہم پر افسوس! ہم ظالم تھے۔

فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ﴿۱۵﴾

سو یہی ان کی پکار رہی یہاں تک کہ ہم نے انہیں کٹے ہوئے (کھیت اور) بجھے ہوئے (شعلے کی طرح) کر دیا۔ (2137)

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿۱۶﴾

اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، کھیلتے ہوئے پیدا نہیں کیا۔ (2138)

2136- اپنی آسودہ حالی اور فراخی کی طرف لوٹ جاؤ تاکہ تم سے سوال کیا جائے کہ تم پر کیا ماجرا گزرا یا اعمال سے سوال مراد ہے۔

2137- ﴿خٰمِدِيْنَ﴾۔ [خَمَدت النَّار] کے معنی ہیں آگ کا شعلہ بجھ گیا اور اس کا کوئلہ نہیں بجھا۔ اور هَمَدت کے معنی ہیں اس کا کوئلہ بجھ گیا۔ (ل) ﴿وَ تَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً﴾ [الحج: 5:22] ''اور تو زمین کو بے حس پڑی دیکھتا ہے۔'' حَصِيْد [دیکھو نمبر: 1388]

قوموں کی تباہی سے مراد:

یہاں ان کی اس آخری حالت کو دو باتوں سے تشبیہ دی ہے۔ ایک کھیتی سے جو ان کی پہلی سرسبزی کی طرف اشارہ ہے، مگر وہ کھیتی کاٹ لی گئی۔ دوسرے آگ سے جس کا شعلہ بجھ گیا ہو۔ گویا وہ ان کا غیظ وغضب فرو ہو گیا۔ پس یہ بھی قوموں کی تباہی ہی ہے کہ ان کے اقبال میں کمی آ جائے اور حق کے مقابل پر ان کا غیظ ٹھنڈا پڑ جائے۔ جو بسا اوقات اس لیے ہوتا ہے کہ وہ مخالفت ترک کر کے حق کو قبول کر لیتی ہیں۔

2138- **جزا و سزا کا انکار خدا کے کاموں کو بے حقیقت قرار دیتا ہے:** لٰعِب [دیکھو نمبر: 845] ایسا فعل ہے جس سے کوئی مقصد صحیح مدنظر نہ ہو۔ پس بتایا کہ زمین میں کوئی مخلوق ہو یا آسمان میں ہر ایک کی پیدائش میں ایک مقصد صحیح ہے اور اللہ تعالیٰ کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں۔ جو شخص اعمال کی جزا و سزا کا منکر ہے وہ گویا اللہ تعالیٰ کی خلق کو محض ایک لعب سمجھتا ہے۔ اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کے اعمال بد پر اسے کوئی سزا نہیں ملے گی۔

لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۱۷﴾

اگر ہم ارادہ کرتے کہ کھیل بنائیں تو اپنے پاس سے اسے بناتے ہم ایسا کرنے والے نہ تھے۔ (2139)

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ وَ لَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾

بلکہ ہم حق کو باطل پر ڈالتے ہیں سو وہ اس کا سر توڑ دیتا ہے۔ پس ناگہاں وہ نابود ہو جاتا ہے اور تمہارے لیے اس کی وجہ سے افسوس ہے جو تم بیان کرتے ہو۔ (2140)

وَ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ مَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ لَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ۚ

اور اسی کے لیے ہے جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو اس کے پاس ہیں وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے اور نہ تھکتے ہیں۔

يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴿۲۰﴾

رات اور دن تسبیح کرتے ہیں سست نہیں ہوتے۔ (2141)

2139- یہاں لَهْوًا کے معنی بہت سے مفسرین سے زَوْجَةٌ اور وَلَدٌ مروی ہیں۔ (ج) لیکن پہلی آیت میں لعب کا قرینہ بتاتا ہے کہ اسی مضمون کو جاری رکھا ہے۔

﴿لَهْوًا وَّ لَعِبًا﴾ میں فرق کے لیے [دیکھو نمبر: 932] اور مطلب یہ ہے کہ ہمارا ارادہ ہی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی چیز بے حقیقت ہو اور ﴿اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ﴾ میں اِنْ نافیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہماری شان ہی یہ نہیں کہ ہم ایسا کرتے۔

2140- يَدْمَغُ۔ دَمْغ کے معنی دماغ کا توڑ دینا ہیں۔ (غ)

پہلی دو آیتوں میں جو کچھ فرمایا تھا اس کا نتیجہ یہاں بتایا کہ اللہ تعالیٰ تو ہر چیز کو مقصد صحیح سے پیدا کرتا ہے اس لیے حق جب آجاتا ہے تو باطل کا باوجود اس کی ساری طاقت کے سر کچل دیتا ہے۔ اسی طرح توحید سے شرک کی تعلیم دنیا سے مٹ جائے گی اور باطل حق کے سامنے بھاگ جائے گا۔

2141- حَسْر کے لیے [دیکھو نمبر: 205] اور اِسْتِحْسَارٌ اس سے ابلغ ہے اور فَتْوٌر کے لیے [دیکھو نمبر: 804] اور يَفْتُرُوْنَ کے معنی کیے ہیں [لَا يَسْكُنُوْنَ عَنْ نِشَاطِهِم فِي العِبَادَةِ] (غ) یعنی عبادت میں ان کو اس قدر خوشی حاصل ہوتی ہے کہ وہ ٹھہرتے نہیں۔ یہاں ﴿مَنْ عِنْدَهٗ﴾ سے فرشتے مراد لیے گئے ہیں۔ مگر یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کے پاک بندوں پر بھی صادق آتے ہیں۔

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴿۲۱﴾

کیا انہوں نے زمین سے معبود بنالیے ہیں جو پیدا کرتے ہیں؟(2142)

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۲۲﴾

اگر ان دونوں میں اللہ کے سوائے (کوئی اور) معبود ہوتا تو دونوں بگڑ جاتے۔ سو اللہ عرش کا رب اس سے پاک ہے جو وہ بیان کرتے ہیں۔(2143)

کیونکہ دن اور رات تسبیح وہ بھی کرتے رہتے ہیں یعنی تسبیح پر مداومت کرتے ہیں قول اور فعل سے۔ اور وہ خدا کی عبادت سے تھکتے نہیں اور انہیں اس میں نشاط بھی حاصل ہوتی ہے، اس لیے اس میں سست نہیں ہوتے۔ یا جس طرح ملائکہ کو رسالت تسبیح سے نہیں روکتی اسی طرح نیک لوگوں کو بھی نہیں روکتی۔ اور یہاں ذکر انبیاء علیہم السلام کا ہے، کیونکہ انہی کے متعلق یہ اثبات کرنا ہے کہ ان کا اللہ تعالیٰ سے تعلق ہے۔ تو پہلے یہ تعلق اس رنگ میں ظاہر کیا کہ ان کے مقابلہ پر بڑی بڑی قومیں بھی گر جاتی ہیں اور اب اسی تعلق کو صاف الفاظ میں بیان فرمایا اور ان کے مقام بلند کا ذکر کیا جو اللہ تعالیٰ کے حضور ان کو حاصل ہے۔ اور بتایا کہ یہی کیسا کھلا نشان ان کے تعلق باللہ کا ہے کہ انہیں ذکر الٰہی میں کمال درجہ کا سرور حاصل ہوتا ہے اور وہ اس کی عبادت اور اس کی مخلوق کی خدمت کرتے ہوئے تھکتے نہیں۔ بلکہ باوجود مخالفت کے اس میں خوشی سے لگے چلے جاتے ہیں۔

2142- ﴿يُنْشِرُوْنَ﴾۔ نُشُوْرٌ اور نَشْرٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 1903] اور [نَشَرَ المَيِّتُ] کے معنی ہیں مردہ جی اٹھا۔ اور [اَنْشَرَهُ اللّٰهُ] کے معنی ہیں اللہ نے مردہ کو زندہ کیا اور [نَشَرَهُ اللّٰه] کے بھی یہی معنی ہیں۔ اور حدیث میں ہے [لَا وَضَّاعَ إِلَّا مَا أَنْشَرَ اللَّحْمَ وَأَنْبَتَ الْعَظَمَ] جہاں [أَنْشَرَ اللَّحْمَ] کے معنی ہیں گوشت کو مضبوط کیا اور قوت دی۔ اِنشَارَ سے جس کے معنی اَحْیَاء ہیں۔ (ل) اس لیے یہاں بعض مفسرین نے معنی مردہ زندہ کرنا کیے ہیں اور بعض نے صرف يُخْلَقُوْنَ یا پیدا کرتے ہیں معنی کیے ہیں۔ اور یہ دوسرے معنی زیادہ موزوں ہیں۔ اس لیے کہ ان معبودان باطل کے متعلق قرآن کریم میں بار بار یہ مطالبہ کیا ہے کہ انہوں نے کیا پیدا کیا ہے؟ ﴿خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ﴾ [الرعد: 16:13] ''جنہوں نے کچھ پیدا کیا ہو، جیسے اللہ پیدا کرتا ہے'' ﴿اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ﴾ [الطور: 35:52] ''یا یہی پیدا کرنے والے ہیں۔''

2143- یہ توحید باری پر دلیل ہے۔ اور اس مضمون کے یہاں لانے کی وجہ [آیت نمبر: 25] میں صاف بیان فرمادی ہے کہ تمام رسول توحید کی تعلیم لے کر آئے اور انہی کی تعلیم سے اللہ تعالیٰ کی توحید دنیا میں پھیلی ایک سے زیادہ خدا ہوتے تو نظام عالم قائم نہ رہ سکتا۔ کیونکہ ایک ایک طرح پر اسے چلاتا تو دوسرا اپنے حسب منشا دوسری طرح پر چلاتا۔ نظام عالم کا قیام ہی اس بات پر ہے کہ ایک قانون کے ماتحت یہ چل رہا ہے۔ مختلف خدا ہوں تو مختلف قانون ہوں اور نظام عالم تباہ ہو جائے۔ اگلی آیت میں ﴿لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ﴾ اسی قانون کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ قانون کے ماتحت سب کو چلنا پڑتا ہے۔ سوال تو وہ شخص کرے جو

لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿۲۳﴾

اس سے پوچھا نہیں جاتا جو وہ کرتا ہے اور ان سے پوچھا جاتا ہے۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۴﴾

کیا اس کے سوائے (اور) معبود بنالیے۔ کہہ، اپنی روشن دلیل لاؤ یہ اس کا ذکر ہے جو میرے ساتھ ہے اور اس کا ذکر جو مجھ سے پہلے ہے، بلکہ ان میں سے اکثر حق کو نہیں جانتے۔ اس لیے وہ منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ (2144)

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْۤ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿۲۵﴾

اور تجھ سے پہلے ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف ہم (یہی) وحی کرتے تھے کہ میرے سوائے کوئی معبود نہیں، سو میری ہی عبادت کرو۔ (2145)

اس قانون سے باہر ہو۔ مگر کل مخلوق ایک قانون میں جکڑی ہوئی ہے۔ اور بندوں پر تو ادنیٰ خلاف ورزی قانون کریں تو مؤاخذہ ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں سوال فعل کے رنگ میں ہے۔

2144- **توحید باری پر دوسری دلیل:** ﴿ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ﴾ سے مراد ہے اس امت کا ذکر اور ﴿ذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ﴾ سے پہلی امتوں کا ذکر۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کی توحید ہی میرے ساتھیوں کا ذکر ہے اور یہی پہلوں کا ذکر تھا یعنی وہ بھی توحید پر قائم تھے۔ جیسا کہ اگلی آیت میں فرمایا کہ پہلے رسولوں کی طرف بھی یہی وحی ہوتی تھی کہ اللہ ایک ہے۔ پس ایک طرف توحید الٰہی ہے جس پر نہ صرف محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کی شہادت ہے بلکہ جس قدر راستباز نیکی کے معلم پہلے گزرے ان کی بھی یہی شہادت ہے۔ اس کے مقابل شرک پر اپنی برہان پیش کرو۔ اور یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ہر قوم کا شرک دوسری قوم سے علیحدہ رنگ کا ہے اور ایک قوم کے شرک کی دوسری تائید نہیں کرتی۔ پرستاران مسیح اہرمن کو اور ہندوستان کے تینتیس کروڑ دیوتاؤں کو نہیں مانتے اور اہرمن کے ماننے والے اور ہندو مسیح کو خدا نہیں مانتے۔ لیکن ان شریکوں کو چھوڑ کر ایک خالق کو ماننے میں سب ایک ہیں۔

2145- یہ تیسری دلیل توحید الٰہی پر ہے کہ جس قدر انبیاء دنیا میں ہوئے کسی کو سوائے توحید کے اور کوئی تعلیم نہیں دی گئی۔ یہ بھی ایک زبردست دلیل توحید الٰہی پر ہے۔ یہاں تک کہ ان انبیاء کی تعلیم پر بڑے بڑے تغیرات آ جانے کے باوجود بھی ان کی تعلیم توحید اب تک قائم ہے۔ اگر ایک خدا کے سوائے کوئی اور بھی خدا ہوتا تو کسی نبی کی تعلیم میں بھی یہ لفظ موجود ہوتے، مگر ایسا نہیں۔

وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۲۶﴾

اور کہتے ہیں رحمٰن نے بیٹا بنالیا، وہ پاک ہے بلکہ وہ معزز بندے ہیں۔

لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَ هُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾

وہ بات میں اس سے آگے نہیں بڑھتے اور اس کے حکم کے مطابق وہ عمل کرتے ہیں۔ (2146)

2146- آیت 26 سے لے کر 29 تک کا مصداق ملائکہ کو سمجھا گیا ہے۔ لیکن کئی ایک قرائن صاف بتاتے ہیں کہ ان میں مراد انبیاء علیہم السلام ہی ہیں۔ اور ولدیت کا عقیدہ بھی انبیاء کے متعلق ہی بنا۔

1. اوّل: ﴿اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ﴾ میں عموماً عیسائیوں کے عقیدۂ ولدیت مسیح کی تردید ہی کی گئی ہے، گو اور بھی اس میں شامل ہو جائیں۔ اور عباد کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ مسیح کے سوائے اور لوگوں کو بھی خدا کا بیٹا بنایا گیا ہے۔ جیسے عزیر جن کا ذکر قرآن شریف میں ہے اور اَور بھی اس قسم کے عقائد مروج ہیں۔
2. دوم: اوپر جو ذکر تھا وہ یہی تھا کہ کسی رسول کو یہ تعلیم نہیں دی گئی کہ خدا کے سوائے کوئی اور بھی لائق عبادت ہے۔ پس یہ بھی رسولوں کا ہی ذکر ہے۔
3. سوم: اُنتیسویں آیت میں ہے ﴿وَ مَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْۤ اِلٰهٌ﴾ جو کوئی ان میں سے کہے میں معبود ہوں۔ ظاہر ہے کہ فرشتے انسانوں کو اس طرح کہنے نہیں آتے۔ بلکہ انسانوں کو انسان ہی کہہ سکتا ہے۔ اور دوسرے انسان تو ایسا کہنے والے ہوئے ہیں یعنی جنہوں نے اپنے آپ کو خدا تو کہا مگر فرشتہ کوئی ایسا نہیں ہوسکتا اور نہ ہوا۔ مفسرین نے اس دقت کو یوں حل کیا ہے کہ ابلیس نے ایسا کہا۔ مگر اول تو ابلیس نے ایسا کہا نہیں۔ دوسرے ابلیس ملائکہ میں سے نہیں۔ پس منہم کی ضمیر انسانوں کی طرف ہی جاسکتی ہے۔
4. چہارم: ﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ [آل عمران: 79:3] ''کسی بشر کے لیے (شایاں) نہیں کہ اللہ اسے کتاب اور حکم اور نبوت دے، پھر وہ لوگوں کو کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ'' میں صاف یہی ذکر موجود ہے۔ اور یہ دونوں مقامات ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں۔
5. پنجم: آخری آیت کے آخری الفاظ ﴿كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ﴾ صاف بتاتے ہیں کہ انسانوں کا ذکر ہے کیونکہ فرشتہ پر لفظ ظالم آ ہی نہیں سکتا۔

پس اس آیت میں انبیاء علیہم السلام کے مقام بلند کا ذکر ہے اور ان کی عصمت پر دلیل ہے۔ وہ نہ تو قول میں اللہ تعالیٰ پر سبقت کرتے ہیں نہ عمل میں۔ یعنی وہی تعلیم لوگوں کو دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ انہیں فرماتا ہے، اور ان کے اعمال بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَ هُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿۲۸﴾

وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ شفاعت نہیں کرتے مگر اسی کے لیے جسے وہ پسند کرے اور وہ اس کی ہیبت سے ڈرتے ہیں۔ (2147)

وَ مَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْۤ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ ع 2 19 2

اور جو کوئی ان میں سے کہے میں اس کے سوائے معبود ہوں تو اسے ہم دوزخ کی سزا دیں گے۔ اسی طرح ہم ظالموں کو سزا دیتے ہیں۔

اَوَ لَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ؕ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۰﴾

کیا جو کافر ہیں وہ غور نہیں کرتے کہ آسمان اور زمین دونوں بند تھے تو ہم نے انہیں کھولا۔ اور ہر زندہ چیز کو ہم نے پانی سے بنایا، تو کیا یہ نہیں مانتے۔ (2148)

ہوتے ہیں۔ پس نہ قولاً اور نہ عملاً وہ خدا تعالیٰ کے حکم سے ایک ذرّہ بھی انحراف کر سکتے ہیں، اور یہی مقام عصمت ہے۔ اور یہ آیت انبیاء علیہم السلام کی عصمت پر قطعی دلیل ہے۔

2147- ﴿مَنِ ارْتَضٰى﴾ کی تفسیر میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے [شَهَادَةُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ] (صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب دُعَاؤُكُمْ إِيمَانُكُمْ، حدیث: 8) اور ان کی شفاعت استغفار ہے جو دنیا و آخرت میں ہے۔ (ر) درحقیقت انبیاء علیہم السلام کی شفاعت بھی اپنی امتوں کے لیے استغفار ہی ہے یعنی ان کی دعا سے اللہ تعالیٰ امتوں کی بعض کمزوریوں کی پردہ پوشی کر دیتا ہے۔

2148- ﴿رَتْقًا﴾۔ فَتَقْنَا۔ رَتْقَ فَتْقَ کے خلاف ہے۔ اور فَتْقَ کے معنی شِقّ یعنی پھاڑنا ہیں۔ اور فَتْقَ تھوڑی بارش کو بھی کہتے ہیں اور صبح کے پھٹنے کو بھی۔ اور رَتق مل جانا ہے اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ آسمان کا رَتْقَ یہ ہے کہ اس سے بارش نہ برسے اور زمین کا رَتْقَ یہ ہے کہ اس میں سبزی نہ اُگے۔ اور فتق اس کے مقابل پر آسمان سے پانی کا برسنا اور زمین میں سبزی کا نکلنا ہے اور یہی زجاج کا قول ہے۔ اور رتق سے مراد یہاں [ذَوِیْ رَتْقَ] ہے یعنی رَتْقَ والے تھے اور رَتْقَ کے معنی ظلمت بھی ہیں۔ (ل)

وَ جَعَلْنَا فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِهِمْ ۪ وَ جَعَلْنَا فِیْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ یَهْتَدُوْنَ ﴿۳۱﴾

اور ہم نے زمین میں پہاڑ بنائے تاکہ وہ انہیں لے کر کانپے نہیں، اور ہم نے اس میں کھلے رستے بنائے، تاکہ وہ راہ پائیں۔ (2149)

قرآن کریم کی علمی صداقتیں جن کا اس کے نزول کے وقت دنیا کو علم نہ تھا:

آسمان اور زمین کے بند ہونے اور ان کے کھولا جانے سے مراد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ یہ سب چیزیں ایک غیر ممیز صورت میں باہم ملی جلی تھیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تمام اجرام کو الگ الگ کرکے ایک دوسرے سے ممیز کر دیا اور اس کی طرف آگے ﴿كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ﴾ [33] میں اشارہ بھی ہے کہ اب وہ سب اپنے اپنے افلاک میں چکر لگا رہے ہیں۔ اور اس معنی سے ملتے جلتے معنی مفسرین نے کیے ہیں۔ اور سائنس بھی یہی کہتی ہے کہ یہ سب نظام ایک ابتری کی حالت میں سے نکل کر اس موجودہ نظام پر آیا اور دوسرے معنی جو اوپر نقل کیے گئے ہیں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں۔ یعنی آسمان سے پانی کا برسنا اور زمین سے روئیدگی کا نکلنا۔ اور اس صورت میں یہ یا تو قانون عام ہے کہ جب آسمان سے پانی نہیں برستا زمین سے بھی روئیدگی نہیں نکلتی۔ اور یہ بھی ابتدائے آفرینش کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پانی کو الگ کر دیا تو اس کے ذریعہ سے زمین میں روئیدگی ہوئی اور اس کی صداقت کی بھی سائنس گواہ ہے اور ﴿وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ﴾ میں اس کے دوسرے معنی کی طرف اشارہ ہے۔

پانی سے ہر چیز کا زندہ ہونا:

یہ بھی ایک عظیم الشان صداقت ہے جس کا اعتراف سائنس نے آج کیا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس صداقت کا علم ایک عرب کے امی کے منہ سے آج سے تیرہ سو سال پیشتر دنیا کو دیا۔ یوں اس ایک آیت میں تین ایسی عظیم الشان علمی صداقتیں اکٹھی کر دی ہیں جن کا علم دنیا کو آج ہوا ہے اور پھر کیسے پُرحکمت طریق سے ایمان کے لیے اسے بطور گواہ ٹھہرایا۔ یعنی جس طرح وہاں آسمان سے پانی آتا ہے تو زندگی نمودار ہوتی ہے، اسی طرح قلب انسانی وحی الٰہی کے لیے بمنزلہ زمین کے ہے۔ جب وحی کی بارش کا اس پر نزول ہوتا ہے تو اس قلب کی مردہ قوتیں زندہ ہوجاتی ہیں۔ اگر انبیاء نہ آئیں تو یہ زمین قلوب انسانی بالکل مردہ ہوجائے۔ اس لحاظ سے پچھلے حصہ میں مکذبین کی ہلاکت کا ذکر کیا۔ کیونکہ جو لوگ اس بارش سے اپنے آپ کو محروم کرتے ہیں ضرور ہے کہ انجام کار وہ نقصان اُٹھائیں۔

2149- فِجَاجَ۔ فَجٌّ کی جمع ہے۔ اور وہ اصل میں شگاف ہے جس کا احاطہ دو پہاڑوں نے کیا ہوا ہے۔ (غ) یا دو پہاڑوں کے درمیان کھلی جگہ اور پھر ہر کشادہ رستہ پر اس کا استعمال ہوا ہے۔ (غ) ﴿مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ﴾ [الحج: 27:22] ''ہر دور کے رستے سے۔''

اس مضمون پر [دیکھو نمبر: 1725] اور یَهْتَدُوْنَ میں گو ظاہر طور پر رستہ پانا ہی مراد ہے مگر اس میں اشارہ یہ ہے کہ ان جسمانی انتظامات سے روحانی انتظامات کی طرف بھی ہدایت ملتی ہے۔

وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۚۖ وَّ هُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۳۲﴾

اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا اور وہ اس کے نشانوں سے منہ پھیر رہے ہیں۔ (2150)

وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ﴿۳۳﴾

اور وہی ہے جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند کو پیدا کیا۔ سب (اپنے اپنے) فلک میں تیزی سے چل رہے ہیں۔ (2151)

2150- سَقْف چھت کو کہتے ہیں اور اس کی جمع سُقُف ہے ﴿لِبُیُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ﴾ [الزخرف: 33:43] ''ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی۔'' اور سَقِیف ہر مکان کو کہتے ہیں جس کی چھت ہو۔ (غ) اور اسی سے سقیفہ بنی ساعدہ ہے جہاں آنحضرت ﷺ کی وفات پر مہاجرین وانصار انتخاب خلیفہ کے لیے جمع ہوئے تھے۔

مَحْفُوْظ۔ حِفظ کا لفظ ہر قسم کے تعہد اور نگہداشت پر بولا جاتا ہے۔ (غ) مثلاً ﴿اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ [الحجر: 9:15] ''ہم خود ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔'' میں مراد ہے کہ اسے تحریف یا فساد سے بچایا جائے گا۔ ﴿وَ الْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ﴾ [الأحزاب: 35:33] ''اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں۔'' میں مراد عفت کی رو سے حفاظت ہے۔ اسی طرح ﴿حٰفِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ﴾ [البقرة: 238:2] ''تم اپنی نمازوں کی محافظت کرو۔'' ﴿وَ مَا جَعَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا﴾ [الأنعام: 107:6] ''اور ہم نے تجھ کو ان پر نگہبان مقرر نہیں کیا۔'' وغیرہ میں تعہد اور نگہداشت کے مختلف پہلو ہیں۔

یہاں آسمان کو سقف کہا ہے اور محفوظ بھی۔ اور دوسری جگہ سماء کو بناء یعنی عمارت کہا ہے۔ ان الفاظ کے استعمال میں بتایا ہے کہ یہ تمام نظام عالم بمنزلہ ایک گھر کے ہے جس کا ایک مالک ہے اور اسے محفوظ کہا ہے، یعنی وہ نظام فساد سے محفوظ ہے۔ یعنی اتنا بڑا نظام بگڑتا نہیں اگر اس کی پیدا کرنے والی ایک مدبر بالا رادہ ہستی نہ ہو تو اتنا بڑا انتظام جس میں لاکھوں اجرام شب و روز گشت لگا رہے ہیں کس طرح قائم رہ سکتا ہے۔ یہی وہ آیات ہیں جن سے کفار اعراض کرتے ہیں اور ان موٹی موٹی باتوں پر غور نہیں کرتے۔

2151- فَلَكٍ۔ [مَجرِی الکَوَاکِب] یعنی سیاروں کے چلنے کی جگہ ہے۔ (غ) یا [مَدَارَالنُّجُوْمُ]۔ (ل) جس میں ستارے گھومتے ہیں۔ (ل) اور سمندر کی موج کو بھی فَلَكٌ کہا جاتا ہے جو آتی اور جاتی ہے اور زجاج نے ﴿كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ﴾ میں کہا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے لیے ایک فَلَكٌ ہے۔ (ل) اور سَبَّحَ کے لیے [دیکھو نمبر: 47] ہوا یا پانی میں تیز گزرنے پر بولا جاتا ہے۔

اجرام سماوی کا اپنے افلاک میں تیز چلنا:

یَّسْبَحُوْنَ کا استعمال بتاتا ہے کہ وہ سیارے خود فلک میں تیز دوڑ رہے ہیں۔ نہ یہ کہ فلک ان کو لیے ہوئے گھوم رہا ہے۔ پس فلک وہ رستہ ہے جس میں یہ اجرام مختلفہ چلتے اور وہ فلک ہر جرم کے لیے الگ ہے۔ جیسا کہ زجاج کا قول ہے۔ اور ﴿فِیْ فَلَكٍ﴾ میں

وَ مَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ اَفَاْىِٕنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴿۳۴﴾

اور تجھ سے پہلے ہم نے کسی انسان کے لیے ہمیشگی نہیں رکھی، تو کیا اگر تو مر جائے تو یہ رہ جائیں گے۔ (2152)

كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ وَ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۵﴾

ہر شخص موت کا مزہ چکھنے والا ہے اور کھرا کھوٹا الگ کرنے کے لیے ہم تمہیں دکھ اور سکھ سے آزماتے ہیں اور تم ہماری طرف ہی لوٹائے جاؤ گے۔ (2153)

وَ اِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَ هُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۶﴾

اور جب کافر تجھے دیکھتے ہیں تیری ہنسی اڑاتے ہیں۔ کیا یہی وہ ہے جو تمہارے معبودوں کا ذکر کرتا ہے اور وہ خود رحمٰن کے ذکر کا انکار کرنے والے ہیں۔

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ سَاُوْرِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۳۷﴾

انسان جلدی کا پتلا بنایا گیا ہے میں تمہیں اپنے نشان دکھاؤں گا سو تم مجھ سے جلدی نہ کرو۔ (2154)

واحد کا استعمال جنس کے لیے ہے جس سے مراد جمع ہوتی ہے۔ جیسے [كَسَاهُمَ حُلَّةً] میں مراد ایک حلّہ نہیں بلکہ ہر ایک کے لیے الگ حُلّہ ہے۔ (د) اور كُلٌّ میں ضمیر بعض نے شمس وقمر کے لیے لی ہے۔ مگر مراد سب کواکب ہیں۔ کیونکہ سورج اور چاند سب سے روشن اجرام ہیں۔ اور بعض کے نزدیک ضمیر نجوم کی طرف ہے گو ان کا ذکر موجود نہ ہو۔ اس لیے کہ جو بیان ہو رہا ہے اس سے ان کے ذکر پر دلالت ملتی ہے۔ (ر) اجرام سماوی کا اپنے اپنے فلکوں میں گھومنا ایک اور علمی حقیقت ہے جس کو قرآن کریم نے ظاہر کیا ہے۔

2152- **خُلد سے خضرؑ اور عیسیٰؑ کے زندہ نہ ہونے پر دلیل:** خُلد سے مراد خُلُوْدٌ ہے۔ (ر) جس کے لیے [دیکھو نمبر: 39] اور یہاں مُکْثٍ طویل یعنی دیر تک زندہ رہنا معنی لے کر اس سے خضر علیہ السلام کے زندہ نہ ہونے پر دلیل لی گئی ہے۔ (ر) پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس استدلال سے کیونکر باہر رہ سکتے ہیں۔

2153- یہاں فِتْنَةً اپنے معنی میں ہے۔ [اِدْخَالُ الذَّهَبَ النَّارَ لِتَظْهَرَ جَوْدَتُهُ مِنْ رِدَاءَتِه] اور شر اور خیر سے مراد یہاں شِدَّةٌ اور رُخَاءٌ یعنی سختی اور نرمی یا دکھ اور سکھ ہیں۔ جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ (ر)

2154- **انسان کے عجلت میں پیدا ہونے سے مراد:** ﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ﴾ کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے

وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾

اور کہتے ہیں یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا، اگر تم سچے ہو۔

لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَ لَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۳۹﴾

کاش جو کافر ہیں اس وقت کو جانیں جب وہ اپنے مونہوں سے آگ کو نہ روک سکیں گے اور نہ اپنی پیٹھوں سے اور نہ انہیں مدد دی جائے گی۔

بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۴۰﴾

بلکہ وہ (گھڑی) ان پر اچانک آ جائے گی۔ پس وہ ان کے ہوش کھو دے گی تو وہ اسے ہٹا نہ سکیں گے اور نہ انہیں مہلت ملے گی۔

وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۴۱﴾ ع 3 12 3

اور یقیناً تجھ سے پہلے رسولوں سے ہنسی کی گئی، تو انہیں جو اِن میں ہنسی کرتے تھے اسی نے آ لیا جس کی وہ ہنسی کرتے تھے۔ (2155)

انسان کو عجلت میں پیدا کیا یا ایسے وقت میں پیدا کیا جب دن تھوڑا رہ گیا تھا۔ مطلب صرف اس قدر کہ عجلت انسان میں اس قدر ہے کہ گویا اسی سے پیدا ہوا ہے۔ جیسے ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضَعْفٍ﴾ [الروم: 54:30] ''اللہ وہ ہے جس نے تمہیں کمزوری (کی حالت) سے بنایا۔'' اور لسان العرب میں ہے کہ جب انسان میں ایک چیز بہت پائی جائے تو اہل عرب یوں کہتے ہیں [خُلِقَتْ مِنْهُ] یعنی تو اس سے پیدا ہوا ہے۔ مثلاً [خُلِقتَ مِن لَعِبٍ] اسے کہیں گے جو بہت کھیلتا ہو، اور سیاق خود بتاتا ہے کہ یہی معنی ہیں۔ اس لیے کہ ساتھ ہی جلد بازی سے روکا ہے۔

2155- اس آیت سے صاف معلوم ہوا کہ وہ عذاب جس کے متعلق وہ سوال کرتے تھے اس دنیا کا عذاب ہے۔ کیونکہ اس چیز کا آ لینا جس سے وہ ہنسی کرتے تھے ان کی ہلاکت ہی ہے نہ کچھ اور۔ اور درحقیقت یہ ﴿سَاُوْرِيْكُمْ اٰيٰتِيْ﴾ اور ﴿فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ﴾ سے صاف ظاہر ہے۔ کیونکہ وہ جس نشان کو جلدی مانگتے ہیں وہ نشان ہلاکت ہے نہ قیامت۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ایسے نشان دکھانے کا وعدہ ہے۔ قیامت نشان نہیں کہلا سکتی۔ پس [آیت نمبر: 39] میں جو آگ کو مونہوں اور پیٹھوں سے نہ ہٹا سکنے کا ذکر ہے تو اس سے مراد مجازاً جنگ ہی ہے اور مونہوں اور پیٹھوں کا ذکر اس لیے کیا کہ جب وہ حملہ کر کے آئیں گے تب بھی دکھ

قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ؕ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۲﴾

کہہ، کون رات کو اور دن کو رحمٰن سے تمہاری حفاظت کرتا ہے؟ بلکہ وہ اپنے رب کے ذکر سے منہ پھیر رہے ہیں۔ (2156)

اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ؕ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَ لَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ﴿۴۳﴾

کیا ان کے معبود ہیں جو ہمارے مقابلے میں انہیں بچا لیں گے۔ وہ آپ اپنی مدد کی طاقت نہیں رکھتے اور نہ ہماری طرف سے ان کی حفاظت ہوگی۔ (2157)

بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَ اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ؕ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ

بلکہ ہم نے انہیں اور ان کے باپ دادوں کو سامان دیا۔ یہاں تک کہ ان کی عمر لمبی ہوگئی، تو پھر کیا غور نہیں کرتے کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹاتے چلے آتے ہیں۔

اٹھائیں گے اور جب پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے تب بھی دکھ اٹھائیں گے۔ اور [آیت نمبر: 40] سے بھی یہی ظاہر ہے۔ اس لیے کہ مبہوت ہونا اسی زندگی کے لیے ہے جب انسان دلائل میں مقابلہ سے عاجز آ جائے۔

2156- يَّكْلَؤُ۔ كَلَاءَةٌ کسی چیز کی حفاظت کرنا اور اس کا باقی رکھنا ہے۔ (غ)

﴿مِنَ الرَّحْمٰنِ﴾ سے مراد رحمٰن کی سزا سے مطلب یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ کی رحمانیت نہ ہوتی تو اپنے اعمال بد کی سزا میں کفار فوراً پکڑے جاتے۔ بایں بھی سب رحمٰن کی طرف رجوع نہیں کرتے۔

2157- ﴿يُصْحَبُوْنَ﴾۔ صَحِبَه کے معنی ہیں عَاشَرَهُ یعنی اس کے ساتھ رہا۔ اور [اَصحَبَ الرَّجُلَ] کے معنی ہیں اس کی حفاظت کی اور یہاں یہی معنی ہیں۔ [يُصْحَبُوْنَ بِالْإِجَارَةِ] اور قتادہ کا قول ہے [لَا يُصْحَبُون مِنَ اللهِ بِخَيْرٍ] اور [اَصْبَحْتُ الرَّجُلَ] کے معنی ہیں صَنَعْتُهُ اس کی حفاظت کی۔ اور [صَحِبَكَ اللهُ] کے معنی بھی [حِفْظَكَ الله] آتے ہیں یعنی اللہ تیری حفاظت کرے۔ (ل) اور یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ ہماری طرف سے وہ چیز نہیں ہوگی جو ان کا ساتھ دے یعنی سکینت اور کشائش اور نرمی وغیرہ۔ جو اولیاء اللہ کو ملتی ہے۔

یعنی جو ان کے معبودان باطل ہیں وہ تو اپنے آپ کو دوسروں کے مقابل پر نہیں بچا سکتے۔ جیسا کہ اگلے رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر سے واضح کر دیا ہے۔ اور جب سزا کا وقت آ جائے گا تو پھر وہ رحمٰن کی حفاظت بھی نہیں رہے گی۔ اس لیے اس وقت ان کے بچنے کا کوئی سامان بھی نہ رہے گا۔

اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾

تو کیا وہ غالب ہیں؟(2158)

قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۖ وَ لَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ﴿۴۵﴾

کہہ، میں تمہیں صرف وحی کے ساتھ ڈراتا ہوں اور بہرے پکار کو نہیں سنتے، جب انہیں ڈرایا جائے۔(2159)

وَ لَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۴۶﴾

اور اگر انہیں تیرے رب کے عذاب کی ہوا بھی لگ جائے تو کہیں گے اے افسوس ہم پر، ہم ہی ظالم تھے۔(2160)

وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ؕ وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَ كَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴿۴۷﴾

اور ہم قیامت کے دن کے لیے انصاف کی میزانوں کو قائم کرتے ہیں۔ پس کسی شخص پر کچھ بھی ظلم نہ کیا جائے گا اور اگر ایک رائی کے دانے کے برابر بھی (عمل) ہوگا ہم اسے لے آئیں گے اور ہم حساب کرنے کو کافی ہیں۔(2161)

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَ ضِيَآءً وَّ ذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾

اور ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرقان اور روشنی اور نصیحت متقیوں کے لیے دی۔(2162)

2158- ایک قوم پر جب ایک لمبے زمانہ تک اللہ تعالیٰ گرفت نہیں کرتا تو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم دنیا میں ہمیشہ رہیں گے، جو چاہیں کریں اور غور کی عادت بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ عُمُر سے مراد یہاں ایک قوم کی عمر ہے۔ اطراف کے گھٹانے سے مراد کفار کے دلوں پر اسلام کا اثر ہونا ہے۔[دیکھو نمبر: 1632] اس لیے فرمایا کہ اب اسلام کے غالب آنے کے نشان تو واضح ہیں۔

2159- وحی کے ساتھ ڈراتا ہوں۔ یعنی یہ میں قیاس سے نہیں کہتا بلکہ اس خبر کا سرچشمہ یقینی ہے۔

2160- ﴿نَفْحَةٌ﴾۔ [نَفَحُ الرِّيْحَ] ہوا چلی اور [نَفَحُ الطِّيْبُ] مشک نے خوشبو دی اور نَفْحَةٌ ہوا کا جھونکا ہے اچھا ہو یا برا۔(ل)

2161- ﴿خَرْدَلٍ﴾ واحد خَرْدَلَةٌ ہے۔ رائی۔ میزان پر [دیکھو نمبر: 1050] اور قِسْطَ۔ مَوَازِيْنَ کی صفت ہے۔ چونکہ مصدر ہے اس لیے واحد لایا گیا اور یا [ذَوَاتَ الْقِسْطَ] مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسا وزن قائم ہے کہ اس سے ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی عمل باہر نہیں رہتا۔

2162- ﴿الْفُرْقَانَ۔ ضِيَآءً۔ ذِكْرًا﴾ سب توریت کے نام بھی ہو سکتے ہیں۔ فُرْقَانَ حق و باطل میں فرق کرنے کے لحاظ سے۔ ضِيَآءً

الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ﴿۴۹﴾

جو غیب میں اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور (اس) گھڑی کا ان کو خوف ہے۔ (2163)

وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ؕ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع

اور یہ (قرآن) بابرکت ذکر ہے جسے ہم نے اتارا ہے۔ تو کیا تم اس کا انکار کرتے ہو۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾ ج

اور ہم نے ہی ابراہیم کو پہلے سے اس کے (لائق حال) ہدایت دی اور ہم اس کو خوب جانتے تھے۔ (2163) ل

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْۤ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾

جب اس نے اپنے بزرگ اور اپنی قوم سے کہا یہ مورتیں کیا ہیں جن کی تعظیم میں تم لگے ہوئے ہو۔ (2164)

اس لحاظ سے کہ ہر قسم کی ظلمت کو دور کر کے اس کی جگہ روشنی کر دی اور ذِکْر اس لحاظ سے کہ اپنے پیروؤں کو کمال تک پہنچایا۔ اور یا فُرْقَان وہ معجزات ہیں جنہوں نے حق و باطل میں فرق کر دیا۔ ضِيَآءً دلائل ہیں جن سے تعلیم روشن ہوئی اور ذِکْر خود وہ تعلیم ہے۔ تینوں چیزیں موسیٰ اور ہارون علیہما السلام دونوں کو دی گئیں۔

2163- بِالْغَيْبِ یا تو مفعول سے حال ہے یعنی اللہ سے ڈرتے ہیں۔ حالانکہ وہ غیب میں ہے اور یا فاعل سے حال ہے۔ یعنی اس حال میں ڈرتے ہیں کہ لوگوں کی نظروں سے غائب ہوتے ہیں۔ اگلی آیت میں توریت کے مقابل پر قرآن کو مبارک کہا ہے جس کے لیے [دیکھو نمبر: 982]

2163ل- **عصمت انبیاء:** رُشْدَهٗ کے لیے [دیکھو نمبر: 609 و 1909] اور چونکہ یہ غَيّ اور ضَلَالٌ کا نقیض ہے اس لیے رُشد کے دینے میں ضَلَالَةٌ اور غَيّ کی نفی پائی جاتی ہے۔ اور رُشْدَهٗ اس لیے کہا کہ یہ معمولی رشد نہیں۔ نہ صرف دنیا کے کاموں میں رُشد تھا بلکہ ایسا رُشد جو اس کے لائق حال تھا۔ یعنی رُشد کامل جو رسولوں اور نبیوں کو دیا جاتا ہے۔ ﴿مِنْ قَبْلُ﴾ میں اشارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف یا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔ اور بعض نے مراد [مِنْ قَبْلِ الْبَلُوْغِ] لیا ہے۔ یعنی بچپن سے ہی وہ ہدایت پر تھے۔ (ج) اور اس کو جاننے میں اشارہ ان کے کمالات کی طرف ہے۔

2164- تَمَاثِيْلُ۔ تِمْثَالٌ کی جمع ہے اور تمثال صورت کو کہتے ہیں۔ (ل) معلوم ہوتا ہے کہ یہ بت انسانوں وغیرہ کی صورت پر بناتے تھے۔ اور مَا یہاں سوال کے لیے نہیں بلکہ تحقیر کے لیے ہے۔

قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾

انہوں نے کہا ہم نے اپنے بڑوں کو ان کی عبادت کرتے ہوئے پایا۔

قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۴﴾

کہا، تم اور تمہارے بڑے کھلی گمراہی میں تھے۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ﴿۵۵﴾

انہوں نے کہا، کیا تو ہمارے پاس حق لایا ہے یا تو کھیل کرنے والوں میں سے ہے۔

قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَ اَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۶﴾

کہا بلکہ تمہارا رب آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ جس نے انہیں پیدا کیا اور میں اس پر گواہی دینے والوں میں سے ہوں۔

وَ تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾

اور اللہ کی قسم میں تمہارے بتوں کو تکلیف پہنچاؤں گا اس کے بعد کہ تم پیٹھ پھیرتے ہوئے واپس چلے جاؤ گے۔ (2165)

فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۸﴾

سو ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، مگر ان کے بڑے کو رہنے دیا تا کہ وہ اس کی طرف رجوع کریں۔ (2166)

2165- كَيْدَ کے لیے [دیکھو نمبر: 507] اور كَادِ کے معنی [اَرَادَ بِسُوْءٍ] آتے ہیں اور یہاں معنی [لَاُرِيْدَنَّ بِهَا سُوْءً] ہی ہیں۔ (غ)

2166- **ابراہیمؑ کے بڑے بت کو نہ توڑنے کی وجہ:** ﴿جُذٰذًا﴾۔ جَذّ کے معنی توڑنا اور ریزہ ریزہ کر دینا ہیں۔ جُذٰذًا توڑے ہوئے اور ٹکڑے ٹکڑے کیے ہوئے کو کہتے ہیں۔ (ل)

﴿كَبِيْرًا لَّهُمْ﴾ میں ضمیر عبادت کرنے والوں کی طرف ہے اور مراد ہے ان کفار کا بڑا بت۔ اور ﴿اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ﴾ میں جمہور نے

قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۹﴾

کہنے لگے ہمارے معبودوں سے کس نے یہ کام کیا ہے، یقیناً وہ ظالموں میں سے ہے۔

قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۰﴾

(لوگوں نے) کہا ہم نے ایک نوجوان کو ان کا ذکر کرتے ہوئے سنا تھا جسے ابراہیم کہا جاتا ہے۔

قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

کہنے لگے، اسے لوگوں کے سامنے لاؤ تاکہ وہ گواہی دیں۔

قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۲﴾

کہا، اے ابراہیم کیا تو نے ہمارے معبودوں سے یہ کام کیا ہے؟

قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۳﴾

اس نے کہا بلکہ یہ کیا (جس نے کیا) ان کا بڑا یہ ہے، سو ان سے پوچھو اگر وہ بولتے ہیں۔ (2167)

ضمیر کو ابراہیم علیہ السلام کی طرف لیا ہے۔ یعنی اس سے دریافت کریں۔ اور بعض نے اللہ کی طرف یعنی بتوں کو ٹوٹا ہوا پا کر اللہ کی طرف رجوع کریں اور بعض نے بڑے بت کی طرف۔ اور میرے نزدیک یہ آخری توجیہ صحیح ہے۔ کیونکہ ابراہیم علیہ السلام یا خدا کی طرف رجوع کرنے کے لیے تو چاہیے تھا کہ سارے توڑ دیئے جاتے۔ اس غرض کے لیے ایک کو باقی رکھ لینا بے معنی ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ حل مشکلات کے لیے اس کی طرف رجوع کریں۔ یعنی ایک طرف تو اپنے بتوں کو ٹوٹا ہوا پا کر یہ سمجھیں کہ اگر یہ نفع نقصان کے مالک ہوتے تو خود کیوں ٹوٹ جاتے اور دوسری طرف بڑے بت کو سالم پا کر اس کی طرف رجوع کرتے اور دیکھ لیتے کہ وہ جو سب سے بڑا تھا باوجود صحیح سالم ہونے کے ان کی کچھ مدد نہیں کر سکتا اور نہ ان کی مشکلات کو حل کر سکتا ہے۔

2167- **حضرت ابراہیمؑ نے بتوں کا توڑنا بڑے بت کی طرف منسوب نہیں کیا، نہ جھوٹ بولا:** یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ ﴿بَلْ فَعَلَهٗ﴾ پر وقف ہے۔ اور اسی کو مدنظر نہ رکھنے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف یہ جھوٹ منسوب کرنا پڑتا ہے کہ آپ نے خود بت توڑنے سے انکار کیا اور جواب یہ دیا کہ بڑے بت نے چھوٹے بتوں کو توڑ دیا ہے۔ یہ کہنا کہ اس طرح ان پر الزام دینا مقصود تھا، صحیح نہیں۔ اس لیے کہ اس قسم کا الزام تو بغیر اس جھوٹ کے بھی دیا جا سکتا تھا اور اس معنی کے خلاف اور قرائن بھی ہیں۔ اول حضرت ابراہیم علیہ السلام نے علی الاعلان انہیں کہہ دیا تھا ﴿لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾﴾۔ مفسرین نے اس

فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓی اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۙ﴿۶۴﴾

سوانہوں نے اپنے آپ کی طرف رجوع کیااور کہنے لگے تم خود ہی ظالم ہو۔ (2168)

صریح خطاب کو جوقوم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیامخفی طور پر کہنا قرار دیا گیا ہے۔ اگر مخفی تھا تو ﴿بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا﴾ کے کیا معنی ہوئے۔ وہ تو کچھ لوگوں کو خطاب کر کے کہہ رہے ہیں کہ تم پھر جاؤ گے تو میں انہیں نقصان پہنچادوں گا۔ اور اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ڈرایا ہوگا کہ اگر تم بتوں کے خلاف کوئی بات منہ سے نکالو گے تو وہ تمہیں نقصان پہنچائیں گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا انہوں نے مجھے کیا نقصان پہنچانا ہے میں انہیں نقصان پہنچاؤں گا۔ اور طرز عبارت صاف بتاتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات میدان مقابلہ میں کہی ہے اور بہت لوگوں نے اسے سنا ہے۔ اسی لیے جب بت ٹوٹے ہوئے پائے گئے اور تحقیقات شروع ہوئی تو بہت سے لوگ بول اٹھے کہ ہم نے ابراہیم کو یوں کہتے سنا تھا۔ اسی لیے ابراہیم علیہ السلام کو بلایا گیا تا کہ سب کے سامنے یہ گواہی دی جائے۔ یہ دوسرا قرینہ اس بات پر ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے فعل کا اخفا نہیں کیا اور اخفا کرنے سے ان کی اصل غرض ہی پوری نہ ہوتی تھی۔ تیسرا اور نہایت قوی قرینہ یہ ہے کہ بڑے بت سے پوچھنے کے لیے نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کہتے ہیں اور نہ پجاری بڑے بت کے متعلق نہ بولنے کا عذر کرتے ہیں۔ بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی کہتے ہیں ﴿فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ﴾۔ اور وہ بھی جواب میں کہتے ہیں ﴿مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ﴾۔ اگر بڑے بت کو اس لیے چھوڑا گیا تھا کہ قتل کو اس کی طرف منسوب کیا جائے تو فَسْئَلُوْہ کہنا چاہئے تھا نہ فَسْئَلُوْهُمْ۔ اور وہ بھی جواب میں کہتے ہیں کہ یہ بولتا نہیں۔ پس وہ صورت الزام بھی نہ رہی جو اس جھوٹ کی غرض بتائی جاتی ہے۔

انبیاء علیہم السلام کسی مصلحت اور غرض کے لیے کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ ان کی سب اغراض اور ان کے سب مصالح سچائی سے پورے ہوجاتے ہیں۔ ﴿بَلْ فَعَلَهٗ﴾ پر وقف ہے۔ اور کسائی جیسے نحوی نے ان الفاظ کی یوں توجیہ کی ہے [فَعَلَهُ مَنْ فَعَلَهُ] کیا جس نے کیا۔ یعنی فاعل محذوف ہے۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب یوں دیا ہے کہ میں نے کیا یا کسی اور نے کیا۔ تم اس تحقیقات کے کیوں درپے ہو اور اس سے کیا حاصل۔ اگر تمہارے یہ بت کچھ کر سکتے ہیں، کوئی نفع نقصان پہنچانے پر قادر ہیں تو ابھی سب سے بڑا بت موجود ہے یہ کیوں کچھ نہیں کر لیتا۔ اگر یہ مجھے نقصان پہنچانے پر قادر ہیں تو یہ بڑا موجود ہے۔ رہا یہ کہ کس نے کیا تو خود ان سے کیوں نہیں پوچھتے۔ جس شخص کو مار پڑے وہ خود بتادیا کرتا ہے کہ مجھے فلاں نے مارا ہے، یہ کیوں نہیں بتاتے۔ پس اگر یہ نفع نقصان پہنچانے پر قادر نہیں اور نہ بول سکتے ہیں تو ان کی عبادت کے کیا معنی۔ اور بَل جو حرف اضراب ہے تو کبھی پہلے جملہ کے خیال کے ابطال کے لیے ہوتا ہے ﴿وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۙ﴿۲۶﴾﴾ [26] اور کبھی ایک غرض سے دوسری غرض کی طرف انتقال کے لیے آتا ہے۔ جیسے ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۙ﴿۱۴﴾ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ؕ﴿۱۵﴾ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۖ﴿۱۶﴾﴾ [الأعلیٰ: 87:14-16] ''وہی کامیاب ہوتا ہے جو اپنے آپ کو پاک کرتا ہے۔ اور اپنے رب کے نام کو یاد کرتا ہے، پس نماز پڑھتا ہے۔ بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔'' (مغنی)

2168- اپنے آپ کی طرف رجوع کرنے سے مراد تفکر و تدبر ہے، یعنی اپنے دلوں میں سوچا۔

ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿٦٥﴾

پھر اپنے سر ڈال کر اوندھے گر گئے (اور بولے) تو جانتا ہے کہ یہ بات نہیں کرتے۔ (2169)

قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ﴿٦٦﴾

کہا تو کیا اللہ کو چھوڑ کر تم اس کی عبادت کرتے ہو، جو تمہیں کچھ نفع نہیں دیتا اور نہ تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔

اُفٍّ لَّكُمْ وَ لِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٦٧﴾

تف ہے تم پر اور اس پر جس کی تم اللہ کے سوائے عبادت کرتے ہو، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟

قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَ انْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿٦٨﴾

کہنے لگے اسے جلا دو اور اپنے دیوتاؤں کی مدد کرو، اگر تم (کچھ) کرنے والے ہو۔

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿٦٩﴾ۙ

ہم نے کہا، اے آگ! ابراہیم پر ٹھنڈک اور سلامتی ہو جا۔ (2170)

2169- ﴿نُكِسُوْا﴾۔ نَكَسَ کے معنی ہیں کسی چیز کا سر کے بل اُلٹا کر دینا اور [نَكَسَ رَأْسَهُ] کے معنی اَمَالَهُ آتے ہیں یعنی اسے جھکایا۔ اسی سے ہے ﴿نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ [السجدة: 12:32] ''اپنے رب کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہوں گے۔'' اور بیماری میں نَکْس یہ ہے کہ افاقہ کے بعد مبتلائے مرض ہو جائے۔ اور یہاں معنی لیے گئے ہیں [رَجَعُوْا عَمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحُجَّةِ لِإِبْرَاهِيْمَ] یعنی ابراہیم کی جس دلیل کا اعتراف کیا تھا اس سے رجوع کیا اور ﴿نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ﴾ [يٰسٓ: 68:36] ''اسے بناوٹ میں اوندھا کر دیتے ہیں۔'' میں معنی ہیں کہ قوت کی جگہ ضعف بدل دیا اور جوانی کی جگہ بڑھاپا۔ (ل)

2170- **حضرت ابراہیمؑ کا آگ سے بچایا جانا:** حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں ڈالا جانے اور رہنے کے قصوں کو بعض مفسرین نے عجیب عجیب پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ چالیس دن تک لکڑیوں کا جمع کیا جانا، پھر ایک عظیم الشان آگ کا جلنا، پھر کفار کو سمجھ نہ آنا کہ کس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس آگ میں ڈالیں اور شیطان کا آ کر انہیں گوپیا بنانا سکھانا، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اس آگ میں چالیس یا پچاس دن رہنا اور ایسے ایسے قصوں کو نقل کر کے روح المعانی میں لکھا ہے کہ ''اس قصہ کی بہت سی

وَ اَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ۚ﴿۷۰﴾

اور انہوں نے اس سے برائی کرنی چاہی تو ہم نے انہی کو نقصان اٹھانے والے کر دیا۔

وَ نَجَّيْنٰهُ وَ لُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾

اور ہم نے اسے اور لوط کو اس سرزمین کی طرف بچا نکالا جس میں ہم نے قوموں کے لیے برکت رکھی تھی۔ (2171)

وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ ؕ وَ يَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَ كُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ﴿۷۲﴾

اور ہم نے اسے اسحاق دیا اور یعقوب پوتا اور سب کو ہم نے نیک بنایا۔

روایتیں ہیں۔ لیکن بحر المحیط میں ہے کہ لوگوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ماجرا کو بیان کرنے میں بہت سی باتیں بنائی ہیں اور صحیح وہی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے کہ آپ کو آگ میں ڈالا گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس آگ کو ٹھنڈا کر دیا۔'' اور یہی صحیح ہے۔ اب قرآن کریم میں کفار کے ارادہ کا ذکر یہاں تو صرف اس قدر ہے کہ انہوں نے کہا حَرِّقُوْهُ۔ اور دوسری جگہ ہے ﴿اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ﴾ [العنکبوت: 24:29] اسے قتل کر دو یا جلا دو۔ اور تَحْرِیْق پر [دیکھو نمبر: 2098]۔ اور تیسری جگہ ہے ﴿ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ﴾ [الصافات: 97:37] اس کے لیے عمارت بناؤ اور اسے جَحِیْم یعنی دوزخ میں ڈال دو۔ اور کیا ہوا اس کے متعلق یہاں فرمایا ﴿قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ ۟﴾ [69] اور دوسری جگہ کہا ہے ﴿فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ﴾ [العنکبوت: 24:29] ''سو اللہ نے اسے آگ سے نجات دی۔'' اور تیسری جگہ ہے ﴿فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ۝﴾ [الصافات: 98:37] ''سو انہوں نے اس کے ساتھ ایک چال چلنی چاہی پر ہم نے انہی کو نیچا دکھایا۔'' اور یہاں بھی ﴿بَرْدًا وَّ سَلٰمًا﴾ کے بعد یہی لفظ آتے ہیں۔ اس لیے اگر ہم قرآن کریم کے بیان سے آگے نہ نکلیں تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ آیا فی الواقع حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس آگ میں ڈالا گیا یا جیسا کہ ﴿فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ﴾ سے ظاہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال حکمت سے حضرت ابراہیم کو آگ میں پڑنے سے پہلے نجات دے دی اور کسی دوسری طرف نکال دیا۔ جیسا کہ [آیت نمبر: 71] سے ظاہر ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وہاں سے ہجرت کر جانا تو صاف معلوم ہوتا ہے۔ جس خدا نے حضرت نوح علیہ السلام کو طوفان سے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سمندر سے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب سے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل سے بچا لیا حالانکہ آپ کے گھر کا محاصرہ ہو چکا تھا، وہ اس بات پر بھی قادر تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ سے بچا دے، خواہ آگ میں پڑ کر آپ بچائے گئے ہوں۔ اور خواہ اس سے بھی پیشتر اس آگ کو ابراہیم کے حق میں ﴿عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ﴾ ٹھنڈا کر دیا ہو۔ اور [آیت نمبر: 71] سے اور ایسا ہی [الصافات: 98:37] سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ابھی ارادہ ہی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں وہاں سے نجات دی۔

2171- برکت والی زمین سے مراد ارض شام ہے۔ جدھر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام ہجرت کر کے چلے گئے۔

وَ جَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَ كَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴿۷۳﴾

اور ہم نے انہیں امام بنایا، وہ ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے اور ہم نے ان کی طرف نیکیوں کے کرنے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی کی اور وہ ہماری عبادت کرنے والے تھے۔

وَ لُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا وَّ نَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ﴿۷۴﴾

اور لوط کو بھی ہم نے فہم اور علم دیا اور اسے اس بستی سے نجات دی جو ناپاک کام کرتی تھی، وہ برے لوگ (اور) نافرمان تھے۔

وَ اَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾ ع 5 25 5

اور ہم نے اسے اپنی رحمت میں داخل کیا وہ نیکوں میں سے تھا۔

وَ نُوْحًا اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۚ ﴿۷۶﴾

اور نوح کو جب (اس سے بھی) پہلے اس نے پکارا تو ہم نے اس کی (دعا) قبول کی سو اسے اور اس کے گھر والوں کو بڑی مصیبت سے نجات دی۔

وَ نَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۷۷﴾

اور اسے اس کی قوم کے مقابل پر مدد دی جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے، وہ برے لوگ تھے۔ سو ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔

وَ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَ كُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ﴿۷۸﴾

اور داؤد اور سلیمان کو جب وہ کھیتی کے معاملہ میں فیصلہ کرنے لگے جب اس میں لوگوں کی بکریاں رات کو چر گئیں اور ہم ان کے فیصلے کے گواہ تھے۔ (2172)

2172- نَفَشَتْ۔ نَفَش اُون کا کوٹنا ہے یہاں تک کہ اس کے اجزا ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔ یعنی اس کا دھننا۔ ﴿كَالْعِهْنِ

فَفَهَّمۡنٰهَا سُلَيۡمٰنَ ۚ وَ كُلًّا اٰتَيۡنَا حُكۡمًا وَّ عِلۡمًا ۫ وَّ سَخَّرۡنَا مَعَ دَاوٗدَ الۡجِبَالَ يُسَبِّحۡنَ وَالطَّيۡرَ ؕ وَ كُنَّا فٰعِلِيۡنَ ﴿۷۹﴾

سو ہم نے وہ (فیصلہ) سلیمان کو سمجھا دیا اور سب کو ہم نے فہم اور علم دیا تھا اور ہم نے پہاڑوں کو جو تسبیح کرتے تھے اور پرندوں کو داؤد کے ساتھ کام میں لگا دیا، اور ہم ہی کرنے والے تھے۔(2173)

الۡمَنۡفُوۡشِ﴾ [القارعة: 5:101] ''دھنی ہوئی اون کی طرح۔'' اور نَفش اونٹوں، بکریوں کا چراوہ ہے کے علم کے بغیر پھیل جانا اور چرنا ہے۔(ل)

بکریوں کے کھیتی چر جانے کے واقعہ کی اہمیت کی وجہ:

اس واقعہ کا ذکر خصوصیت سے کیا۔ حالانکہ حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام بادشاہت کی حیثیت میں بڑے بڑے اہم امور ملکی طے کرتے تھے اور یہ ایک نہایت خفیف سا معاملہ ہے کہ کسی کی بکریاں رات کو کھیت چر گئیں۔ اس میں یہ توجہ دلائی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنے والے بادشاہ بھی ہو جائیں تو وہ اپنی رعایا میں سے معمولی لوگوں کی شکایات کی طرف اسی طرح توجہ کرتے ہیں جس طرح اہم امور ملکی کی طرف۔ اس کی مثالیں ہمارے خلفائے راشدین اور بعض دیگر اسلامی بادشاہوں میں ملتی ہے کہ کس طرح رعایا کے غریب سے غریب لوگوں کی خاطر وہ خود تکلیف اور مشقت اٹھانے کے عادی تھے۔ یہی بادشاہت کا وہ رنگ ہے جسے اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے کہ بڑے سے بڑے آدمی تک، چھوٹے سے چھوٹے آدمی کی آواز پہنچ سکے۔ آج کل کی جمہوریت میں دفاتر کی پابندیوں کی روک بڑے بڑے مطلق العنان بادشاہوں کے استبداد سے بڑھ کر ہے اور وہ سادگی جو انسانیت کا اصل فخر ہے بالکل مفقود نظر آتی ہے۔

2173- سلیمان علیہ السلام کو فیصلہ سمجھا دیا۔ حالانکہ حضرت داؤد علیہ السلام کی موجودگی میں سلیمان علیہ السلام نبی نہ تھے۔ پس فہم معاملات میں بعض وقت ایک غیر نبی نبی سے بڑھ سکتا ہے۔

پہاڑوں کی تسبیح:

پہاڑ حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔ بعض کے نزدیک یہ معجزہ تھا جس طرح کنکریوں کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں تسبیح پڑھنا جسے دوسرے لوگوں نے سنا۔ مگر یہاں اس کا ذکر بطور معجزہ نہیں، جو ایک دفعہ کا واقعہ ہے۔ بلکہ عادت کے طور پر ہے۔ اور اکثر لوگوں کا قول یہ ہے کہ ان کی تسبیح کو صرف حضرت داؤد علیہ السلام سنتے تھے۔ اور بعض نے کہا کہ یہ تسبیح زبان حال سے تھی۔ اور حالانکہ قرآن کریم کے ظاہر الفاظ طیر کو تسبیح میں ساتھ شامل نہیں کرتے مگر بعض نے یہ مانا ہے کہ پرندے بھی آپ کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔

وَ عَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ اور ہم نے اسے تمہارے لیے زِرہ بنانی سکھائی، تاکہ

حضرت داؤدؑ کے لیے پہاڑوں اور پرندوں کا مسخر کیا جانا:

قابل غور بات یہ ہے کہ یہاں اور سورۂ سبا میں بھی تین باتوں کا اکٹھا ذکر ہے۔ ① پہاڑوں کی تسخیر، یعنی ان کا حضرت داؤد علیہ السلام کے کام میں لگایا جانا اور تسبیح کرنا۔ ② پرندوں کا ان کے کام میں لگایا جانا۔ ③ حضرت داؤد علیہ السلام کا زرہیں بنانا۔ چنانچہ دوسری جگہ ہے ﴿یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَهٗ وَ الطَّیْرَ ۚ وَ اَلَنَّا لَهُ الْحَدِیْدَ ۙ۝ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّ قَدِّرْ فِی السَّرْدِ﴾ [سبأ: 10-11:34] ''اے پہاڑو! اس کے ساتھ تسبیح کرو اور پرندوں کو (ان کے) کام میں لگایا اور ہم نے ان کے لیے لوہے کو نرم کر دیا کہ فراخ زرہیں بنا اور ان کے بنانے میں اندازۂ نگاہ رکھ۔'' دونوں جگہ ان تینوں باتوں کا اکٹھا ذکر کرنا بتاتا ہے کہ ان میں باہم کوئی تعلق ہے۔ اب تینوں میں سے جہاں تک زرہیں بنانے کا سوال ہے۔ اس کی غرض ظاہر ہے۔ تاکہ وہ جنگوں میں کام دیں اور خود بھی قرآن کریم نے یہ وضاحت کر دی ہے ﴿لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ﴾۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے وقت میں بڑی بڑی فتوحات حاصل ہوئیں جن سے سلطنت اسرائیلی نہایت درجہ مستحکم ہوگئی۔ اور جب زرہیں بنانے کا تعلق صاف طور پر ان فتوحات سے ہے تو لازماً دوسری باتوں کا تعلق بھی فتوحات سے ہی ہونا چاہئے۔ ورنہ تینوں باتوں کا اکٹھا ذکر نہ ہوتا۔ پرندوں کا تعلق جنگوں اور فتوحات سے دو طرح پر ہوسکتا ہے۔ ایک یہ کہ پرند جنگوں میں خبر رسانی کا کام دیتے تھے اور اسی لیے حضرت سلیمان علیہ السلام کے ذکر میں بھی پرندوں کا ذکر آتا ہے۔ اور میرے نزدیک پرندوں کے حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ مسخر ہونے یا کام میں لگایا جانے سے منشا یہی ہے۔ مگر ایک اور رنگ میں بھی پرندوں کا ذکر فتوحات میں اشعار عرب میں آتا ہے۔ جیسا کہ نابغہ کے شعر میں ہے [إِذَا مَا غَدَوْا بِالْجَيْشِ، حَلَّقَ فَوْقَهُمْ ... عَصَائِبُ طَيْرٍ تَهْتَدِي بِعَصَائِبِ] (تاج العروس، جلد1، صفحہ 6264)۔ یعنی جب وہ لشکر کے ساتھ نکلتا ہے تو اس کے اوپر پرندوں کے جھنڈ حلقہ باندھ لیتے ہیں، جو ان لشکروں کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اور بائبل میں بھی پرندوں کے مفتوح فوج کو کھانے کا ذکر ہے۔ ''تو اسرائیل کے پہاڑوں پر گر جائے گا تُو اور تیرا سارا لشکر اس گروہ سمیت جو تیرے ساتھ ہے اور میں تجھے ہر قسم کے شکاری پرندوں اور میدان کے درندوں کو خوراک دوں گا۔'' [حزقی ایل: 39:12]۔ تیسری بات پہاڑوں کی تسخیر اور ان کی تسبیح ہے۔ اب ایک رنگ میں تو زمین و آسمان کی سب چیزیں انسانوں کے لیے مسخر ہیں۔ چنانچہ دوسری جگہ کشتی کی اور دریاؤں کی اور چاند اور سورج کی تسخیر اور ان کی تسبیح کا ذکر آتا ہے۔ بلکہ یوں بھی ﴿سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ﴾ [الجاثیة: 13:45] ''اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنے (فضل سے) تمہارے کام پر لگایا۔ اور تسبیح بھی ہر چیز کرتی ہے ﴿وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾ [بنی إسرائیل: 44:17] ''اور کوئی چیز نہیں مگر اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے۔'' اس لیے یہاں کوئی خصوصیت ہونی چاہئے۔ میرے نزدیک زرہوں اور پرند کے تعلق کو مدنظر رکھتے ہوئے پہاڑوں کا مسخر ہونا اور تسبیح کرنا اس معنی میں ہے کہ وہاں پر حضرت داؤد علیہ السلام کی حکومت قائم ہوگئی۔ اور ان کی تسبیح سے مراد ان پہاڑی قوموں کا تسبیح کرنا ہے جو ظاہری اور باطنی دونوں رنگوں میں حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ ہوگئیں۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ جس معنی

مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ﴿۸۰﴾

تمہاری لڑائی میں تمہاری حفاظت کرے، تو کیا تم شکرگزار ہو۔ (2174)

وَ لِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَ كُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ﴿۸۱﴾

اور ہم نے سلیمان کے لیے تیز چلنے والی ہوا کو (کام میں لگا دیا) وہ اس کے حکم سے اس زمین کی طرف چلتی تھی۔ جس میں ہم نے برکت رکھی تھی اور ہم ہر چیز کو جاننے والے ہیں۔ (2175)

میں کل مخلوق کو انسان کے لیے مسخر کیا ہے اسی معنی میں پہاڑ اور پرند حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے مسخر کیے۔ کل مخلوق انسان کے لیے اسی معنی میں مسخر ہے کہ وہ اس کے کاموں میں معاون ہے۔ پھر جس قدر انسان اس پر زیادہ تصرف حاصل کر لے اسی قدر زیادہ مسخر ہو جاتی ہے۔ مثلاً ہوا سب انسانوں کے لیے بھی مسخر ہے یعنی ان کے کام میں لگی ہوئی ہے۔ پھر جو انسان اس سے دوسروں سے بڑھ کر فائدہ اٹھاتا ہے اس کے لیے خصوصیت سے مسخر ہوگئی۔ پس پہاڑوں اور پرندوں کے مسخر ہونے کے معنی سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتے کہ پہاڑ اور پرندان کے کام میں دوسروں کی نسبت زیادہ آئے اور ان کی نصرت کا موجب ہو گئے۔ اور اسی کی طرف ﴿وَ كُنَّا فٰعِلِيْنَ﴾ میں اشارہ ہے۔ ایسا ہی تسبیح جس رنگ میں کوئی چیز کرتی ہے اسی رنگ میں کرے گی۔ پہاڑ بھی خدا کی تسبیح کرتے ہیں، مگر اسی طرح جس طرح ہر چیز تسبیح کرتی ہے ﴿وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ [بنی إسرائیل: 44:17] ''لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔'' ہاں اگر جبال سے مراد اہل جبال یعنی پہاڑی قومیں لی جائیں جیسے بعض وقت قریہ سے مراد اہل قریہ یعنی بستی کے رہنے والے لیے جاتے ہیں یا بڑے بڑے انسان مراد لیے جائیں [دیکھو نمبر: 1623] تو ان کی تسبیح بلاشبہ حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح ہی ہوگی۔

2174- ﴿لَبُوْسٍ﴾۔ لَبِسْتُ کے معنی ہیں میں نے پہنا اور لَبَسْتُ کے معنی ہیں میں نے مشتبہ کر دیا۔ اور لِبَاسٍ اور لَبُوْسٍ اول سے ہے۔ [مَا يُلْبَسُ] یعنی جو چیز پہنی جائے۔ اور لُبُوْسٍ کے معنی کپڑے بھی ہیں اور ہتھیار بھی۔ اور اس صورت میں مذکر ہوتا ہے اور جب اس سے مراد زرہ ہو تو مؤنث لایا جاتا ہے۔ (ل)

حضرت داؤدؑ کو زرہ بنانی سکھائی:

یہ سب علم اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ اس سے پہلے زرہ کا استعمال بالکل نہ ہوتا ہو۔ بلکہ مفسرین نے لکھا ہے کہ اس میں انہوں نے ترقی کی اور یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ کثرت سے ان کا استعمال کیا۔ اور مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام پہلے بیت المال سے گزارہ لیتے تھے، پھر زرہیں بنا کر اس کی اجرت سے اپنا گزارہ کرتے تھے۔

2175- ﴿وَ لِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ﴾ میں سَخَّرْنَا مقدر ہے یعنی سلیمان کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ سلیمان علیہ السلام کے لیے شیاطین

وَ مِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَ يَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَ كُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۲﴾

اور کئی سرکش جو اس کے لیے غوطہ زنی کرتے اور اس کے سوائے اور کام بھی کرتے تھے اور ہم ان کی حفاظت کرنے والے تھے۔ (2176)

نے ایک فرسخ لمبا اور ایک فرسخ چوڑا فرش بنایا تھا جس پر سلیمان علیہ السلام مع اپنے درباریوں اور دیگر لوگوں کے بیٹھ جاتے اور پرندے اکٹھے ہو کر سر پر سایہ کیے ہوئے ہوتے اور پھر ہوا اسے اٹھا کر لے جاتی۔ اور بعض نے ایک عجیب قسم کا مرکب بتایا ہے، جس میں ہزار ہا مکان تھے اور جسے شیاطین اٹھاتے اور پھر ہوا اسے چلاتی۔ مگر قرآن کریم ان قصوں سے پاک ہے۔ اور ہوا کا حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے مسخر ہونا یہی ہے کہ آپ کے کام میں معاون تھی۔ جس طرح ہوا سے مدد ملا کرتی ہے اور غالباً ﴿تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ﴾ میں اس ہوا کے کشتیاں چلانے کی طرف اشارہ ہے یا خود کشتیوں کا چلنا ہی مراد ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ ہوائے موافق یا بادبانوں وغیرہ کے استعمال سے جہاز دور دور کا سامان لے کر ملک شام میں جو ارض مبارک ہے آتے تھے۔ چنانچہ یہودی انسائیکلو پیڈیا میں ہے کہ خلیج فارس اور خلیج عقبہ کے درمیان حضرت سلیمان علیہ السلام کے جہاز چلتے تھے اور اس تجارت سے ملک میں سونا اور دولت بہت بڑھ گئی تھی اور یہی وجہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی شان و شوکت کی تھی اور قرآن شریف میں دوسری جگہ آتا ہے ﴿وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ﴾ [ابراهيم: 32:14] ''اور کشتیوں کو تمہارے کام میں لگایا تاکہ وہ سمندر میں اس کے حکم سے چلیں۔'' اور ہوسکتا ہے کہ یہاں بھی بِاَمْرِهٖ میں اشارہ امر الٰہی کی طرف ہی ہو۔ اور یہاں رِیح کو عَاصِفَةً کہا ہے۔ اور دوسری جگہ ﴿تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً﴾ [صٓ: 36:38] ''وہ اس (اللہ) کے حکم سے نرمی سے چلتی تھی۔'' تو مطلب یہ ہے کہ وہ ریح عاصفہ ایسی نہ تھی کہ نقصان پہنچاتی، بلکہ باوجود تیز ہوا ہونے کے اس میں نرمی پائی جاتی تھی۔

2176- ﴿الشَّيٰطِيْنِ﴾۔ شیطان ہر سرکش کو کہتے ہیں جنّ ہو یا انسان۔ [دیکھو نمبر: 26] اور یہاں سرکش انسان ہی مراد ہیں جیسا کہ ان کے غوطہ زنی کرنے اور دوسرے کام کرنے سے صاف ظاہر ہے۔

﴿يَّغُوْصُوْنَ﴾۔ غَوْصٌ کے معنی ہیں پانی کے نیچے داخل ہونا اور اس سے کسی چیز کا نکال لانا اور پھر جو کوئی کسی پوشیدہ چیز پر اچانک آئے اور اسے نکال لے تو اسے غَائِصٌ کہا جاتا ہے خواہ وہ کوئی چیز ہو یا علم ہو۔ اور غَوَّاصٌ وہ ہے جو کثرت سے ایسا کرے۔ اور يَّغُوْصُوْنَ سے یہاں یہی مراد ہے کہ اس کے لیے نادر کام اور افعال بدیعہ کرتے تھے اور فقط موتیوں کا نکالنا مراد نہیں۔ (غ) مگر دوسرے اعمال کا ذکر ﴿يَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ﴾ میں موجود ہے۔ اور اس کی تفصیل دوسری جگہ موجود ہے۔ ﴿يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَ تَمَاثِيْلَ وَ جِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَ قُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ﴾ [سبأ: 13:34] ''وہ اس کے لیے جو وہ چاہتا تھا بناتے تھے (یعنی) مسجدیں اور مجسمے اور (بڑے بڑے) لگن جیسے تالاب۔''

شیاطین غوطہ خور اور معمار انسان تھے:

حالانکہ لغت میں صاف طور پر موجود ہے کہ شیطان سرکش انسان کو بھی کہا جاتا ہے اور قرآن کریم میں شیاطین الانس بالتصریح

وَ اَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ﴿۸۳﴾

اور ایوب کو جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے تکلیف پہنچی ہے اور تو سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ (2177)

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّ اٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ

تو ہم نے اس کی (دعا) قبول کی اور جو اسے تکلیف دی تھی وہ دور کر دی۔ اور ہم نے اسے اس کے اہل دے دیئے اور ان کی مثل ان کے ساتھ اور (بھی دیئے)

مذکور ہیں۔ اور کئی جگہ پر خود مفسرین نے بالاتفاق شیاطین سے مراد صرف سردار یعنی انسان لیے ہیں۔ جیسے ﴿وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ﴾ [البقرة: 14:2] ''اور جب اپنے شیطانوں کے ساتھ اکیلے ہوتے ہیں۔'' اور حالانکہ یہاں غوطہ زنی کا صاف ذکر ہے۔ جو کام ہمیشہ سے انسان کرتے چلے آئے ہیں اور اب بھی کرتے ہیں۔ لیکن مفسرین کو یہ اصرار ہے کہ یہ سچ مچ کے شیطان ہی تھے جو غوطہ زنی کرتے تھے اور پھر ﴿كُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ﴾ میں یہ قصہ بنایا گیا ہے کہ ان شیطانوں پر ایک گروہ ملائکہ کا اور مومن جنوں کا حفاظت کے لیے مقرر تھا۔ اور پھر وہ شیطان سچ مچ معماروں کا کام بھی کرتے تھے ﴿وَ الشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّ غَوَّاصٍ ۙ﴾ [صٓ: 37:38] ''اور شیطانوں کو ہر ایک معمار اور غوطہ زن کو (ان کے کام میں لگایا)۔'' گویا وہ زمانہ ایسا تھا کہ جتنے کام آج کل انسان کرتے ہیں اس وقت وہ شیاطین کیا کرتے تھے اور شیاطین اس وقت بدی کے محرک نہ تھے۔ اور یہ قانون اللہ تعالیٰ کا پیچھے بنا کہ [إِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِي مِنِ ابْنِ آدَمَ مَجْرَى الدَّمِ] (صحيح البخاري، كتاب الاحكام، باب الشَّهَادَةِ تَكُونُ عِنْدَ الْحَاكِمِ فِي وِلَايَتِهِ الْقَضَاءِ اَوْ قَبْلَ ذَلِكَ لِلْخَصْمِ، حديث: 7171) صاف اور سادہ الفاظ کو عجوبہ بنانے سے اور قرآن کریم کے سادہ بیانات میں عجیب وغریب قصے داخل کرنے سے قرآن کریم کی عظمت بڑھتی نہیں بلکہ اس سے اسے نقصان پہنچتا ہے۔ اور ان کاریگروں کو شیاطین اس لیے کہا کہ وہ سرکش قوموں میں سے تھے۔ جنہیں سلیمان علیہ السلام نے فتح کر کے مغلوب کیا تھا اور بعض کو ان میں سے قید کر کے کام لیا جاتا تھا۔ جیسا کہ ﴿وَّ اٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ﴾ [صٓ: 38:38] ''اور اَوروں کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے۔'' سے ظاہر ہے۔ اسی لیے ﴿كُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ﴾ بھی فرمایا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت نہ ہوتی تو ان سے کام لینا آسان نہ تھا۔

2177- **حضرت ایوبؑ کی تکلیف:** قرآن کریم نے اس ضرّ یا تکلیف کی کوئی تشریح نہیں فرمائی۔ مفسرین نے کچھ بائبل سے اخذ کر کے اور کچھ اس پر بڑھا کر خطرناک پیرایہ جسمانی تکالیف کا بنایا ہے۔ گو یہ بھی ممکن ہے۔ مگر اصل یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تکالیف اور رنگ کی ہوتی ہیں۔ اور بیماریوں سے بڑھ کر ان میں صبر دکھانا پڑتا ہے۔ ہاں یہاں سے یہ معلوم ہوتا ہے اور دوسری جگہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام اپنے اہل وعیال سے الگ ہو گئے تھے۔

رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ ذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۴﴾

یہ ہماری طرف سے رحمت تھی اور عبادت کرنے والوں کے لیے یاد دلانے کو ہے۔ (2178)

وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِدْرِيْسَ وَ ذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۸۵﴾ۚ

اور اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل کو۔ سب صبر کرنے والوں میں سے تھے۔ (2179)

وَ اَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۶﴾

اور ہم نے انہیں اپنی رحمت میں داخل کیا۔ وہ نیکوکاروں میں سے تھے۔

2178- **حضرت ایوب علیہ السلام کو ان کے اہل اور اس کی مثل دیا جانے سے مراد:** کہا گیا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کی سب اولاد مرگئی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اسے زندہ کر دیا۔ اور ﴿اٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ﴾ سے یہی مراد لی گئی ہے۔ لیکن قرآن شریف میں نہ ان کے مرنے کا ذکر ہے نہ دوبارہ زندہ ہونے کا۔ اور دینے سے مطلب صرف یہی ہے کہ وہ دوبارہ اسے مل گئے۔ اور صرف وہی مل گئے بلکہ اور بھی اللہ تعالیٰ نے اسے بہت سی اولاد دی۔ اور ابن عساکر وغیرہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا [رَدَّ اللّٰهُ تَعَالٰى امْرَأَتَهُ إِلَيْهِ وَزَادَ فِي شَبَابِهَا حَتّٰى وَلَدَتْ لَهُ سِتًّا وَّعِشْرِيْنَ ذَكَرًا] (ر) یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کی بی بی اس کی طرف لوٹا دی اور اس کی شباب کو بڑھایا یہاں تک کہ چھبیس لڑکے اس کے لیے جنی اور ﴿ذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ﴾ یہ بتانے کے لیے ہے کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اللہ تعالیٰ اسے دنیوی نعمتوں سے محروم نہیں رکھتا۔

2179- ﴿ذَا الْكِفْلِ﴾ **ذُوالْكِفْل** کون تھے؟ اس میں اختلاف ہوا ہے۔ کئی اور ناموں کے علاوہ زکریا، الیاس، یوشع بن نون کا نام بھی لیا گیا ہے۔ راڈویل نے ایک سیاح کی سند پر لکھا ہے کہ عرب کے لوگ حزقیل کو کِفْل کہتے ہیں اور مفسرین لکھتے ہیں کہ یہود کہتے ہیں کہ ذُوالْكِفْلَ سے مراد حزقیل ہیں۔ پس ان دونوں شہادتوں کی بنا پر یہی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ذُوالْكِفْلَ حضرت حزقیل کا نام ہے۔

جب حضرت ایوب علیہ السلام کا ذکر کیا جو صبر میں ایک نمونہ ہیں تو اپنے اپنے وقتوں کے اور ایسے انبیاء کا بھی ذکر کیا جنہوں نے صبر میں کمال نمونہ دکھایا۔ ان سب کے سرتاج حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں جنہوں نے بلوغت سے پیشتر اپنی گردن چھری کے آگے رکھ دی۔ اور حزقیل نبی بھی صبر میں نمونہ ہیں۔ اس لیے کہ وہ اس وقت مبعوث ہوئے جب یہودی قید اور یروشلم تباہ ہو گیا تھا اور بنی اسرائیل پر یہ سخت ترین مصائب کا زمانہ تھا۔

وَ ذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۷﴾

اور ذوالنون کو جب وہ (قوم پر) ناراض ہو کر چلا گیا، اس نے گمان کیا کہ ہم اس پر تنگی نہیں کریں گے، پس اس نے مشکلات میں پکارا کہ تیرے سوائے کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے میں اپنے (اوپر) ظلم کرنے والوں میں سے ہوں۔ (2180)

2180- ﴿ذَا النُّوْنِ﴾۔ نُون بڑی مچھلی کو کہتے ہیں۔ اور حضرت یونس علیہ السلام کو ﴿ذَا النُّوْنِ﴾ مچھلی کی وجہ سے کہا گیا ہے جس نے آپ کو منہ میں لیا تھا۔ (غ)

﴿نَّقْدِرَ عَلَيْهِ﴾۔ قدر کے معنی اندازہ ہیں۔ اور [قَدَرْتُ عَلَيْهِ الشَّيْءَ] کے معنی ہیں ضَيَّقْتُهُ اسے تنگ کر دیا۔ گویا یہ اندازہ ہے اس وسعت کے خلاف جو بغیر حساب میں پائی جاتی ہے ﴿وَ مَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ﴾ [الطلاق: 7:65] ''اور جس پر اس کی روزی تنگ ہے۔'' ﴿يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ﴾ [الرعد: 26:13] ''جس کے لیے چاہتا ہے رزق فراخ کرتا ہے۔'' اور یہاں بھی ﴿لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ﴾ کے معنی ہیں اس پر تنگی نہیں کریں گے۔ (غ)

حضرت یونسؑ کی قوم پر ناراضگی اور بلا اذن ہجرت:

حضرت یونس علیہ السلام ناراض ہو کر چلے گئے۔ کس سے ناراض ہو کر؟ قریباً تمام بڑے بڑے مفسرین نے اس قول کو ترجیح دی ہے کہ وہ اپنی قوم سے ناراض ہو کر چلے گئے۔ یعنی ان لوگوں سے جن کی طرف انہیں بھیجا گیا تھا۔ کیونکہ انہوں نے آپ کو قبول نہ کیا۔ یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ سے ناراض ہو کر چلے گئے تھے کہ اس نے عذاب کیوں ٹال دیا کسی صورت میں صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ نبی تو ایک طرف رہا یہ ایک معمولی مومن کی بھی شان کے خلاف ہے۔ اور یہ آپ کا قوم سے ناراض ہو کر جانا بطور ہجرت تھا، لیکن ہجرت کا حکم ان کو نہیں ہوا تھا۔ (ر) اور انہیں یہ یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ ان پر گرفت نہیں کرے گا۔ مگر ہجرت کے لیے انہیں حکم الٰہی کا انتظار کرنا چاہئے تھا۔ اسی لیے فرمایا ﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَ لَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ﴾ [القلم: 48:68] ''سو اپنے رب کے حکم کا صبر سے انتظار کر اور مچھلی والی کی طرح نہ ہو جا۔'' نتیجہ یہ ہوا کہ ظلمات یعنی مشکلات میں پڑ گئے۔ ظلمات بمعنی شدائد کے لیے [دیکھو نمبر: 957] اور ﴿اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ اس لیے کہ نبی کی ادنیٰ غلطی بھی گو وہ کسی حکم الٰہی کی خلاف ورزی نہ ہو اور گناہ نہ ہو ظلم میں داخل ہے۔ کیونکہ ظلم کا لفظ بہت وسیع ہے۔ اور ہجرت جیسا اچھا فعل بھی محض اس لیے ظلم میں داخل ہو گیا کہ بغیر اجازت الٰہی اسے اختیار کیا گیا۔ [دیکھو نمبر: 55] مچھلی کے پیٹ میں رہنے کے متعلق دوسری جگہ بحث آئے گی۔ اور حضرت یونس علیہ السلام کی دعا ﴿لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ کے متعلق حدیث میں ہے کہ جو مومن مشکلات میں یہ دعا مانگتا ہے اللہ تعالیٰ اسے ضرور قبول فرماتا ہے۔ اسی کی طرف اگلی آیت کے الفاظ ﴿وَ كَذٰلِكَ نُنْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ میں اشارہ ہے۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۪ وَ نَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَ كَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾

سو ہم نے اس کی (دعا) قبول کی اور اسے غم سے نجات دی اور اسی طرح ہم مومنوں کو نجات دیتے ہیں۔

وَ زَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّ اَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۸۹﴾

اور زکریا کو، جب اس نے اپنے رب کو پکارا، میرے رب مجھے اکیلا نہ چھوڑیو اور تو سب وارثوں میں سے بہتر ہے۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۪ وَ وَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا ؕ وَ كَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ﴿۹۰﴾

سو ہم نے اس کی (دعا) قبول کی اور اسے یحییٰ دیا اور اس کی عورت کو اس کے لیے اچھا کر دیا۔ وہ نیکیوں میں جلدی کرتے تھے اور ہمیں امید اور خوف سے پکارتے تھے اور ہمارے سامنے عاجزی کرنے والے تھے۔ (2181)

وَ الَّتِيْۤ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَ جَعَلْنٰهَا وَ ابْنَهَاۤ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۱﴾

اور وہ جس نے اپنی عصمت کو محفوظ کیا، سو ہم نے اپنا کلام اس میں پھونکا اور اسے اور اس کے بیٹے کو قوموں کے لیے نشان بنایا۔ (2182)

اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖۗ وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۹۲﴾

بے شک یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں۔ سو میری عبادت کرو۔ (2183)

2181- بی بی کی اصلاح یا اچھا کرنے سے مراد بعض مفسرین نے یہ کی ہے کہ اس کے اخلاق اچھے کر دیئے گئے۔ مگر قرآن کریم نے جو نقص خود دوسری جگہ بیان فرمایا ہے وہ اس کا عقیم ہونا ہے۔ اسی نقص کے دور کرنے کو یہاں اصلاح بیان فرمایا ہے۔

2182- **نفخ روح سے کیا مراد ہے؟** حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق آتا ہے ﴿نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ﴾ [ص: 72:38] ''اپنی روح اس میں پھونکو۔'' پس اگر نفخ روح سے مراد جان ڈالنا لیا جائے تو یہ جان حضرت مریم علیہا السلام میں پھونکی گئی، حالانکہ وہ زندہ تھیں۔ اس مشکل کو دور کرنے کے لیے بعض مفسرین نے یہ توجیہ اختیار کی ہے کہ یہاں مضاف حذف ہے یعنی مراد ہے [فَنَفَخْنَا فِي أَنْبِهَا مِنْ رُّوْحِنَا]۔ مگر یہ تاویل بعید ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہاں روح سے مراد کلام الٰہی ہے۔ [دیکھو نمبر: 111] یعنی اس نے اپنا کلام پھونکا یا اسے وحی کی اور مریم اور ان کے بیٹے کے نشان ہونے پر [دیکھو نمبر: 2271]۔

2183- اُمَّةً کے معنی جماعت بھی ہیں اور دین بھی۔ جیسے ﴿اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ﴾ [الزخرف: 22:43] ''ہم نے اپنے بزرگوں کو

وَ تَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَیْنَهُمْ ؕ كُلٌّ اِلَیْنَا رٰجِعُوْنَ ﴿۹۳﴾ ع

اور انہوں نے اپنے دین کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، سب ہماری طرف لوٹ کر آنے والے ہیں۔

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْیِهٖ ۚ وَ اِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴿۹۴﴾

تو جو کوئی اچھے کام کرے اور وہ مومن ہو، تو اس کی کوشش کی ناقدری نہ ہوگی۔ اور ہم اس کے لیے لکھ لیتے ہیں۔ (2184)

وَ حَرٰمٌ عَلٰى قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَاۤ اَنَّهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۹۵﴾

اور اس بستی پر جسے ہم ہلاک کر دیں، لازم ہے کہ وہ لوٹ کر نہ آئیں۔ (2185)

ایک طریق پر پایا۔'' (غ) اور یہاں دونوں طرح پر معنی ہو سکتے ہیں۔ یعنی انبیاء اور راستبازوں کی ایک ہی جماعت ہے۔ جس طرح ایک کو اپنے اعدا سے نجات دی دوسرے کو بھی دی، اور اس کی عبادت کرنے والوں کو وہ اب بھی نجات دے گا۔ اور دین کے معنی لے کر مراد یہ ہوگی کہ ملت توحید اور اسلام ہی سب کا اصل مذہب ہے۔

2184- كُفْرَانَ نعمت کا کفر اور كُفْرَانَ اس کے ادائے شکر کو ترک کر کے اس کا چھپانا ہے اور یہاں یہی معنی ہیں۔ اور كُفْرَانَ کا اکثر استعمال انکار نعمت ظاہری ہیں۔ اور كُفر کا اکثر استعمال دین میں ہے اور كَفُوْرٌ کا استعمال دونوں میں ہے۔ ﴿فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا﴾ [بنی إسرائیل: 99:17] ''مگر ظالموں کو سوائے انکار کے کچھ منظور نہیں۔'' ﴿اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا﴾ [الدهر: 3:76] ''چاہے وہ شکر گزار ہے اور چاہے ناشکرا۔''

مومنوں کو خوش خبری:

جب گروہ انبیاء کا اور ان کو مصائب سے نجات دینے کا ذکر کیا اور اس میں رسول اللہ ﷺ کو خوش خبری دی تو اب ساتھ ہی مومنوں کا بھی ذکر کیا تا کہ وہ مصائب کے وقت ان الفاظ سے تسلی حاصل کریں کہ وہ بھی اگر انبیاء کے نقش قدم پر چلیں تو ان کے ساتھ بھی ویسا ہی معاملہ ہوگا۔ خدا کی راہ میں کوشش کرنے والا کوئی ہو، اس کی کوشش کی اللہ تعالیٰ قدر دانی فرماتا ہے۔ اور یہاں مراد ایسی ہی کوشش ہے جو حق کے پھیلانے سے تعلق رکھتی ہے۔ کیونکہ اس کے بالمقابل اگلی آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جن کو مخالفت حق کی وجہ سے ہلاک کر دیا جاتا ہے۔

2185- حَرٰمٌ کے معنی ممنوع [نمبر: 181] میں بیان ہو چکے ہیں۔ اگر یہی معنی لیے جائیں تو ﴿لَا یَرْجِعُوْنَ﴾ بطور تاکید ہوگا۔ گویا ترکیب عبارت یوں ہے کہ جس بستی کو ہم ہلاک کر دیں اس کے لیے پھر حق کی مخالفت ممنوع ہے۔ اس لیے کہ وہ لوٹ کر نہیں آتے۔ اور حَرَام بمعنی واجب بھی اشعار جاہلیت میں آیا ہے۔ [فَإِنَّ حَرَامًا لَا أَرَى الدَّهْرَ بَاكِيًا عَلَى شَجْوِهِ إِلَّا

حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ وَ هُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿۹۶﴾

یہاں تک کہ جب یاجوج اور ماجوج کھول دیئے جائیں گے اور وہ ہر بلندی سے تیزی سے پھیل جائیں گے۔ (2186)

بَكَيْتُ عَلٰى عَمْرٍو] (لسان العرب، جلد12، صفحہ119) یعنی ''مجھ پر واجب ہے کہ میں کسی کو اس کے غم پر روتا ہوا نہ دیکھو مگر کہ عمرو پر روؤں۔'' اور دوسری قراءت حِرم اس کے معنی کی مؤید ہے۔ مطلب دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔

مُردے اس دنیا میں واپس نہیں آ سکتے:

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک قول میں صراحت سے منقول ہے کہ مراد اس جگہ یہ ہے کہ جو لوگ ہلاک کر دیئے جائیں گے وہ قیامت سے پہلے پھر دوبارہ نہ آئیں گے۔ یعنی اس دنیا میں لوٹ کر نہ آئیں گے اور دوسرے اقوال میں منقول ہے کہ جن پر ہلاکت کا حکم ہو چکا وہ توبہ نہیں کریں گے۔ اور پہلا قول زیادہ واضح ہے۔ (ث) اگر سیاق مضمون کو مدنظر رکھا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ یہاں ذکر یہی ہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ ہلاک کر دے وہ اس دنیا میں لوٹ کر نہیں آتے۔ کیونکہ ذکر انبیاء اور ان کے مخالفین کا ہے۔ جب انبیاء اور راستبازوں کی اعدا اور مصائب سے نجات کا ذکر کیا تو ساتھ ہی بتا دیا کہ جو قوم بوجہ مخالفت حق ہلاک کر دی جاتی ہے وہ لوٹ کر اس دنیا میں نہیں آتی کہ دوبارہ مخالفت کرے۔ لیکن اس خاص موقعہ پر ایک عام سا قانون بیان کر دیا کہ جو مر جائے وہ اس دنیا میں لوٹ کر نہیں آیا کرتا۔ جس طرح پچھلی آیت میں بھی ایک خاص موقعہ پر عام قانون بیان کر دیا۔ اور اسی پر نسائی اور ابن ماجہ کی حدیث بھی گواہ ہے جو پہلے نقل ہو چکی ہے۔ [دیکھو نمبر: 434] جس میں مذکور ہے کہ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کے باپ کو جو شہید ہو گئے تھے جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو کچھ مانگتے ہو مانگو، اور انہوں نے دوبارہ دنیا میں جانے کی خواہش ظاہر کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا [قَدْ سَبَقَ مِنِّي أَنَّهُمْ إِلَيْهَا لَا يُرْجَعُونَ] (جامع الترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب وَمِنْ سُورَةِ آلِ عِمْرَانَ، حدیث: 3281) یہ میں پہلے سے کہہ چکا ہوں کہ مردے لوٹ کر دنیا میں نہ جائیں گے۔

2186- ﴿حَدَبٍ﴾۔ حَدَب پیٹھ کا باہر کو نکل آنا اور پیٹ کا اندر ہو جانا یعنی کبڑا ہو جانا اور اسی سے حَدَب بلند زمین کو کہتے ہیں۔ [حَدَبَ المَاءُ] پانی کی موج کی بلندی کو کہا جاتا ہے۔ (ل)

خروج یاجوج ماجوج اور مسلمان:

یاجوج ماجوج پر [دیکھو نمبر: 1960] وغیرہ ان کے کھولے جانے سے مراد ان کا خروج ہے، جس کا ذکر احادیث میں آتا ہے اور یہ آخری زمانہ کے متعلق ہے۔ اور کئی حدیثوں میں خروج دجال اور خروج یاجوج ماجوج کا اکٹھا ذکر ہے اور خروج یاجوج ماجوج سے مسلمانوں پر خاص طور سے بلاؤں اور مشکلات کا آنا مذکور ہے۔ یہاں تک لکھا ہے کہ مسلمان اپنے شہروں اور گھروں میں گھس جائیں گے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حکومت اور سلطنت ان کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اور یہ جو بعض احادیث میں

وَ اقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۹۷﴾

اور سچا وعدہ قریب آ جائے گا تو ناگاہ ان کی آنکھیں جو کافر ہیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی، ہم پر افسوس! ہم اس سے غفلت میں رہے۔ بلکہ ہم ظالم تھے۔ (2187)

اِنَّكُمْ وَ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

تم اور وہ چیزیں جن کی تم اللہ کے سوائے عبادت کرتے

ہے کہ وہ دریاؤں کا سب پانی پی جائیں گے تو شاید اس لحاظ سے ہے کہ پانی ہی زندگی کا موجب ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ دوسری قوموں کی اور بالخصوص مسلمانوں کی زندگی کے سامانوں کو وہ چٹ کر جائیں گے۔ اور ہر بلندی سے تیزی سے نکل پڑنے کے معنی صاف ہیں کہ ہر بلندی پر تھوڑے عرصہ میں قابض ہو جائیں گے۔ یعنی خشکی اور تری کے مقامات پر ان کا قبضہ یا ان کا تصرف ہو جائے گا۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ وہ ساری زمین کو ڈھانک لیں گے۔ اور نَسَلَ کے لیے [دیکھو نمبر: 264] اور ان الفاظ کی یہ مراد حدیث سے بھی ظاہر ہے جہاں آتا ہے [لاَ يَدَانِ لأَحَدٍ بِقِتَالِهِمْ] (صحيح مسلم، كتاب الفتن وأشراط الساعة، باب ذِكْرِ الدَّجَّالِ وَصِفَتِهِ وَمَا مَعَهُ، حديث: 7560) ان کے ساتھ جنگ کرنے کی طاقت دنیا میں کسی قوم کو نہیں ہوگی۔ اور ان کی آخری ہلاکت کا ذکر یوں فرمایا ﴿وَ تَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ﴾ [الكهف: 99:18] ''اور ہم انہیں اس دن ایک دوسرے پر موجیں مارتے ہوئے چھوڑ دیں گے۔'' یعنی وہ ایک دوسرے سے ہی الجھ پڑیں گے اور یہی ان کی ہلاکت کا موجب ہوگا۔ اور یہاں یاجوج ماجوج کا ذکر اس لیے کیا کہ حق کے مخالفین اور ان کی ہلاکت اور ہلاکت کے بعد دنیا میں لوٹ کر نہ آنے کا ذکر تھا۔ تو اس لیے فرمایا کہ اتنی بڑی زبردست اقوام بھی جو دنیا کی ہر بلندی پر قابض ہوں گی، اور جن کے ساتھ جنگ کی طاقت کسی کو نہ ہوگی وہ بھی اس قانون کے ماتحت ہیں، وہ بھی آخر ہلاک ہوں گی اور ہلاکت کے بعد لوٹ کر نہ آئیں گی۔

2187- ﴿شَاخِصَةٌ﴾۔ شَخْصٌ کھڑے ہوئے ہوئے انسان کا وجود ہے جو دور سے نظر آئے۔ (غ) اور [شَخَصَ بَصَرُ فُلَانٍ] کہا جاتا ہے جب آنکھ کھولے اور جھپکے نہیں۔ اور حدیث میں ذکر میت میں ہے [اِذَا شَخَصَ بَصَرُهُ] یعنی پلکوں کا اوپر کو اٹھ جانا اور نظر کی تحدید اور اس کا جگہ سے اُکھڑ جانا اور جب ایک قلق میں ڈالنے والا امر کسی پر پڑے تو کہا جاتا ہے [شَخَصَ بِهِ]۔ (ل) ﴿تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ﴾ [ابراهيم: 42:14] ''جب آنکھیں کھلی رہ جائیں گی۔''

وعدہ حق سے مراد مفسرین نے قیامت لی ہے۔ مگر اس سے موت بھی مراد ہو سکتی ہے۔ اور ہلاک یا زوال طاقت کا وقت بھی ہو سکتا ہے۔ بلکہ چونکہ ذکر یہاں ان کی ہلاکت کا ہی چلتا ہے اس لیے زیادہ قرین قیاس یہی ہے۔ اور اس وقت وہ کہیں گے کہ یہ امر حق تھا جس کی طرف سے ہم غافل رہے۔ بلکہ غافل ہی نہیں ظلم کر کے اس کی مخالفت کرتے رہے۔ اس میں بھی ان کے قبول حق کی طرف ہی اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿۹۸﴾

ہو دوزخ کا ایندھن ہو، تم اس میں داخل ہو گے۔ (2188)

لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ؕ وَ كُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۹۹﴾

اگر یہ معبود ہوتے تو اس میں داخل نہ ہوتے اور سب اسی میں رہیں گے۔

لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ هُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

ان کے لیے اس میں چلانا ہوگا اور وہ اس میں کچھ نہ سنیں گے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ۙ

جن کے لیے ہماری طرف سے پہلے سے بھلائی آ چکی ہے وہ اس سے دور رکھے جائیں گے۔ (2189)

2188- ﴿حَصَبُ﴾۔ حَصَب اور حَصْبَة پتھروں یا کنکریوں کو کہتے ہیں، اور حَصْب کنکریاں پھینکنے کو۔ اور حَصَب ہر اس چیز کو کہتے ہیں یعنی لکڑی وغیرہ جو آگ میں ڈالی جائے، اور یہاں یہی مراد ہے۔ اور بعض کے نزدیک اہل یمن کی لغت میں حَصَب اور حَطَب کے ایک ہی معنی ہیں۔ (ل) اور بعض نے حَصَبُ کے معنی صرف [مَا يُرْمٰى بِهٖ] لیے ہیں، یعنی پھینکی گئی چیز۔

کفار یا مخالفین حق کا جہنم کا ایندھن ہونا تو ایک ظاہر امر ہے۔ لیکن ﴿مَا تَعْبُدُوْنَ﴾ سے کیا مراد ہے؟ بعض نے کہا صرف بت مراد ہیں کیونکہ ما غیر ذوی العقول کے لیے آتا ہے۔ اور بعض احادیث ایسی ہیں جن میں ہر قسم کے معبود یہاں مراد لے کر نیکوں کو ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى﴾ میں مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ مگر [دیکھو نمبر: 1391] جہاں دکھایا گیا ہے کہ اس موقعہ پر مراد صرف وہ معبودان باطل ہیں جو اپنے آپ کو معبود کے رنگ میں پیش کرتے تھے۔ یعنی ان کے بڑے بڑے پیشوا جو حکم خدا کے خلاف انہیں اپنی مرضی پر چلاتے تھے اور ان سے حق کی مخالفت کراتے تھے۔ اس لیے کہ ﴿مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ میں یوں تو سورج، چاند، ستارے، ہوائیں، بادل، دریا، درخت، پتھر، کتے، بلیاں اور دوسرے بہت سے جانور آ جاتے ہیں، اس لیے کہ دنیا کی قوموں نے ان چیزوں کی عبادت کی ہے لیکن ان چیزوں کا حشر نہیں ہوگا کہ وہ خاص خاص چیزیں جن کی عبادت کی گئی ہے از سر نو بنا کر دوزخ میں ڈالی جائیں اور نہ ان کے دوزخ میں ڈالنے سے کچھ حاصل ہے۔ پس یہاں مراد ان کے کبراء اور سادات ہیں جن کے دوزخ میں ہونے کا بار بار ذکر بھی آتا ہے۔ چونکہ انہوں نے اپنی عبادت کرائی یا ایسی تعظیم کرائی جو عبادت کے قائمقام تھی اس لیے وہ مستحق دوزخ ہیں اور ﴿لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً﴾ میں یہی بتایا ہے کہ جیسا یہ اپنے آپ کو پیش کرتے تھے اگر سچ مچ ویسے ہوتے تو دوزخ میں کیوں داخل ہوتے۔

2189- ﴿سَبَقَتْ﴾۔ سَبْق کے معنی اصل میں چلنے میں آگے بڑھنا ہیں۔ پھر کسی چیز کے نفوذ یا ہو جانے پر یا تقدم یعنی پہلے سے ہو چکا ہونے پر بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ ﴿وَ لَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ﴾ [طٰهٰ: 129:20] ''اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک

لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَ هُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

وہ اس کی آہٹ (بھی) نہ سنیں گے اور وہ اس میں جو ان کے دل چاہیں رہیں گے۔ (2190)

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَ تَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

سب سے بھاری گھبراہٹ انہیں غمگین نہ کرے گی اور فرشتے ان سے ملیں گے۔ یہ وہ تمہارا دن ہے جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا تھا۔ (2191)

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ؕ كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ

جس دن ہم آسمان کو لپیٹ لیں گے جس طرح تحریروں کا طومار لپیٹ لیا جاتا ہے۔ جس طرح ہم نے پہلی پیدائش شروع کی اسے پھر بنائیں گے۔

بات پہلے نہ ہو چکی ہوتی۔'' (غ)

یہ لوگ وہی ہیں جو دنیا میں ہی جنت میں پہنچ چکے ہیں، یعنی نفوس مطمئنہ۔ اس لیے فرمایا کہ انہیں حسنیٰ پہلے سے پہنچ چکی ہے۔

2190- حَسِيْسَ۔ حِسّ کے لیے [دیکھو نمبر: 440 و 538] اور ﴿حَسِيْسَ﴾ اور حِسّ سے مراد حرکت بھی لی جاتی ہے۔ (غ)

﴿اشْتَهَتْ﴾۔ [شَهِيَ الشَّيْءُ] اور اِشْتَهَاهُ کے معنی ہیں ایک چیز سے محبت کی اور اس کی طرف مائل ہوا۔ (ل)

مومنوں کی محبت اور ان کا میلان کس چیز کی طرف ہوتا ہے؟ دنیا میں وہ معمولی سے معمولی چیزوں پر گزارہ کر لیتے ہیں اور ان کی اصل تڑپ اور خواہش حصول رضائے الٰہی کے لیے ہوتی ہے۔ اسی لیے جنت کی سب سے بڑی نعمت بھی وہی ہے۔ ﴿وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ [التوبة: 72:9] ''اور اللہ کی رضا سب سے بڑھ کر (نعمت) ہے۔''

2191- ﴿الْفَزَعُ﴾۔ فَزَع اس انقباض اور گھبراہٹ کو کہتے ہیں جو ڈرانے والی چیز سے پہنچے۔ اور وہ جَزَع کی جنس سے ہے۔ (جَزَع اس غم کو کہتے ہیں جو انسان کو اس کے مقصد سے روک دے۔) اللہ تعالیٰ کے متعلق خوف کا لفظ آ سکتا ہے فَزَع کا نہیں۔ ﴿فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ﴾ [النمل: 87:27] ''پس جو کوئی آسمانوں میں ہیں اور جو کوئی زمین میں ہیں۔'' ﴿وَ هُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ ﴿۸۹﴾﴾ [النمل: 89:27] ''اور وہ اس دن گھبراہٹ سے امن میں ہوں گے۔'' اور [فَزِعَ اِلَيْهِ] کے معنی ہیں فزع کے وقت اس کی مدد چاہی۔ اور [تَفْرِيْعٌ، فَزَعْ] کا دور کرنا ہے ﴿حَتّٰۤى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ﴾ [السبأ: 23:34] ''یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہو جائے گی۔'' اور ﴿الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ﴾ سے مراد آگ میں داخل ہونے کی گھبراہٹ ہے۔

وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۱۰۴﴾

یہ ہم پر وعدہ ہے ضرور ہم (یہ) کرنے والے ہیں۔ (2192)

وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے۔ (2193)

2192- نَطْوِی۔ طوی (مصدر طَیٌّ) کے معنی لپیٹا۔ اور طَیّ کے معنی عمر گزر جانا بھی آتے ہیں۔ جیسے [طَوَتكَ خُطُوْبُ دَهْرِكَ بَعْدَ نَشْرٍ] میں اور ﴿وَ السَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ﴾ [الزمر: 67:39] ''اور آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے۔'' میں پہلے معنی بھی ہو سکتے ہیں اور دوسرے بھی۔ یعنی مراد صرف یہ ہے کہ وہ فنا کر دیئے جائیں گے۔ (غ) اور [طَوَی الْبِلَادُ] کے معنی شہر سے شہر کو گیا۔ (ل)

سِجِلّ۔ سَجل کے لیے [دیکھو نمبر: 1491] اور سِجّل کتاب عہد وغیرہ کو کہتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک اس سے مراد کاتب ہے۔ اور سِجّل صحیفہ کو بھی کہتے ہیں جس میں کتاب ہو۔ (ل) یعنی کچھ لکھا جائے۔

آسمان کو لپیٹنا یا فنا کرنا۔ دونوں سے مراد ایک انقلاب عظیم معلوم ہوتا ہے۔ اور ﴿كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ﴾ سے بظاہر مراد قیامت ہے لیکن اس انقلاب عظیم کی طرف بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے جب کفر کی صف لپیٹ کر اس کی جگہ حق کو قائم کیا جائے۔ جیسا کہ یہ نظارہ ہمارے نبی کریم ﷺ کی زندگی میں ملک عرب میں دیکھا گیا۔ اور اس اشارہ کو کھول کر اگلی آیت میں بیان کیا ہے۔ جہاں یہ ذکر ہے کہ زمین کے وارث اس کے صالح بندے ہوں گے۔

2193- **راستباز زمین کے وارث ہوں گے:** [زبور: 29:37] میں ہے ''صادق زمین کے وارث ہوں گے۔'' اسی کی طرف یہاں اشارہ ہے۔ اور اَلْاَرْض سے مراد ارض مقدس بھی ہو سکتی ہے۔ [دیکھو نمبر: 156] جہاں دکھایا گیا ہے کہ اس زمین کا وعدہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے تھا۔ اور اب اس نسل ابراہیمی کے قائمقام مسلمان ہیں اور اس کا دو دفعہ ان کے ہاتھ سے عارضی طور پر نکل جانا پیشگوئیوں کے مطابق ہے۔ اور اَلْاَرْض سے مراد عام زمین بھی ہو سکتی ہے۔ اور اس صورت میں اشارہ مسلمانوں کی حکومت اور بادشاہت کی طرف ہوگا۔ جیسا کہ احادیث نبوی میں صاف آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: [إِنَّ رَبِّي زَوَى لِي الْأَرْضَ فَرَأَيْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا وَإِنَّ مُلْكَ أُمَّتِي سَيَبْلُغُ مَا زُوِيَ لِي مِنْهَا وَإِنِّي أُعْطِيتُ الْكَنْزَيْنِ الْأَحْمَرَ وَالْأَبْيَضَ.] (سنن أبی داود، کتاب الفتن، باب ذِكْرِ الْفِتَنِ وَدَلاَئِلِهَا، حدیث: 4254؛ مسند أحمد، جلد37، صفحہ 78) یعنی ''میرے رب نے زمین کو میرے لیے سکیڑ دیا اور اس کی مشرقی اور مغربی زمینیں مجھے دکھائی گئیں اور میری امت کی بادشاہت وہاں تک پہنچے گی جہاں تک زمین سکیڑ کر مجھے دکھائی گئی اور مجھے دو خزانے دیئے گئے

اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ یقیناً اس میں عبادت کرنے والے لوگوں کے لیے پیغام ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ اور ہم نے تجھے تمام قوموں کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔ (2194)

ہیں، ایک سرخ اور ایک سفید۔'' یہ حدیث مسلم، ابوداؤد، ترمذی میں ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ملک عرب سے باہر اپنی امت کی بادشاہت کی کھلی پیشگوئی کی تھی۔ اور موجودہ غلبہ کفر اس کو غلط نہیں کرتا۔ اس لیے کہ اسی حدیث میں یہ پیشگوئی بھی موجود ہے کہ مجھے دو خزانے دیئے گئے ایک سرخ اور ایک سفید۔ سرخ خزانہ مشرقی اقوام کا اسلام میں داخل ہونا ہے اور سفید خزانہ مغربی اقوام کا جو سفید رنگ کی ہیں۔ اور اس میں صاف بشارت ہے کہ جس طرح مشرق میں اسلام پھیلا، مغرب میں بھی پھیلے گا۔ اور یوں بھی مسلمان زمین کے وارث ہوں گے۔ اس لیے اگلی آیت میں توجہ دلائی کہ عابد بن جاؤ تو بادشاہت بھی تمہیں مل جائے گی۔

2194- آنحضرت ﷺ کو دنیا کی تمام قوموں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا۔ یہ ایک عظیم الشان حقیقت ہے۔ اس میں نہ صرف یہ بات بتائی گئی ہے کہ آپ کُل دنیا کی طرف مبعوث ہوئے۔ بلکہ یہ بھی کہ آپ رحمت کے رنگ میں مبعوث ہوئے اور دشمنوں کو تباہ و برباد کرنے کے لیے نہیں آئے جیسا کہ زبور دشمنوں کی تباہی اور ویرانی کی دعاؤں سے بھری ہوئی ہے۔ بلکہ دشمنوں کے ساتھ بھی نہ صرف آپ نے ہی رحم کا سلوک کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے ساتھ رحم ہی کیا اور ان کی ہلاکت محض ان کی قوت توڑ دینے تک محدود کی۔ نہ قوم کی تباہی اور بربادی پر۔ چنانچہ یہ تشریح ان الفاظ کی خود حدیث نبوی میں موجود ہے کہ جب آپ سے کہا گیا یا رسول! مشرکوں پر بددعا کیجئے تو آپ نے فرمایا: [إِنِّي لَمْ أُبْعَثْ لَعَّانًا وَإِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَةً] (صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآدب، باب النَّهْيِ عَنْ لَعْنِ الدَّوَابِّ وَغَيْرِهَا، حديث: 6778) میں لعنت کرنے کے لیے مبعوث نہیں کیا گیا بلکہ رحمت بنا کر مبعوث کیا گیا ہوں۔ پس آپ کے اعدا سے اللہ تعالیٰ نے بھی رحم کا ہی سلوک کیا۔ اور اسی بات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے یہاں اس کا ذکر کیا۔ کیونکہ یہاں ذکر تو یہی تھا کہ راستباز زمین کے وارث ہوں گے۔ اور یہ وراثت چاہتی تھی کہ دشمن برباد ہوں اور تباہ ہو جائیں تا کہ ان کی جگہ راستباز لیں۔ تو فرمایا کہ ایسا نہیں ہوگا اس لیے کہ ہم نے رسول کو رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ پس مسلمانوں کو زمین کی وراثت ملے گی۔ مگر نہ پہلی قوموں کو برباد کر کے بلکہ ان پر رحم کے ذریعہ سے۔ چنانچہ اسلام کی تاریخ میں ایسا ہی نظر آتا ہے کہ کسی قوم کو برباد نہیں کیا گیا۔

غیر مسلموں کے لیے رحمت:

ان الفاظ میں یہ بھی بتایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی رحمت اس قدر وسیع ہے کہ صرف دوست ہی اس سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے بلکہ دشمن بھی اور یہ صرف مسلموں کے لیے ہی نہیں بلکہ غیر مسلموں کے لیے بھی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کی تعلیم سے بہت سی ان قوموں نے فائدہ اٹھایا ہے اور یہ ان کے حق میں رحمت ثابت ہوا، جنہوں نے بظاہر اسلام قبول نہیں کیا۔ خود یورپ کی قومیں اسی

قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۸﴾

کہہ، میری طرف یہی وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے تو کیا تم (اللہ کے) فرمانبردار بنتے ہو۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ وَ اِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

پھر اگر پھر جائیں تو کہہ دے میں نے تمہیں انصاف کی بات کہہ کر خبردار کر دیا ہے اور میں نہیں جانتا کہ وہ قریب ہے یا دور ہے جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے۔ (2195)

اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَ يَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

وہ پکار کر کہی ہوئی بات کو جانتا ہے اور اسے بھی جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو۔

وَ اِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۱۱﴾

اور میں نہیں جانتا شاید وہ تمہارے لیے آزمائش ہے اور ایک وقت تک فائدہ اٹھانا ہے۔

قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ وَ رَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ع

(رسول نے) کہا، میرے رب حق کے ساتھ فیصلہ فرما۔ اور ہمارا رب رحمٰن ہے جس سے ان باتوں پر مدد مانگی جاتی ہے جو تم بیان کرتے ہو۔ (2196)

﴿رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ سے فائدہ اٹھا رہی ہیں، گو اس کی دشمن بھی ہیں۔ وہ اصول سعی پر عمل پیرا ہیں جو انجیل کی نہیں بلکہ قرآن کریم کی تعلیم ہے۔ وہ ہر بات میں ایک نظام رکھتی ہیں۔ یہ بھی اسلام کی تعلیم ہے جس نے نماز اور خیرات تک میں اعلیٰ درجہ کا نظام قائم کیا ہے۔ وہ وقت کی قدر کرتی ہیں جو اسلام کی کھلی تعلیم ہے۔ ان کا رستوں تک کا صاف رکھنا اسلام کی تعلیم [إِمَاطَةُ الأَذَى عَنِ الطَّرِيقِ] (صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب شُعَبِ الإِيمَانِ، حديث: 162) پر عمل ہے۔ اور آج بیسیوں خوبی کی باتیں جو ان میں ہم دیکھتے ہیں ایک ایک کر کے اسلامی تعلیم کا نتیجہ دکھائی جا سکتی ہیں۔

2195- ﴿اٰذَنْتُ﴾۔ [اٰذِنْتُهٗ بِكَذَا] اور اٰذَنْتُهٗ کے ایک ہی معنی ہیں۔ یعنی ایک بات کا علم دے دینا۔ (غ) [دیکھو نمبر: 123 و 356] ﴿عَلٰى سَوَآءٍ﴾ کے لیے [دیکھو نمبر: 455] اور انصاف کی بات یہ ہے کہ ایک خدا کو مان لیں۔ دوسری جگہ ہے ﴿تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ﴾ [آل عمران: 64:3] ''اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔''

2196- مصائب اور مشکلات کے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف ہی رجوع کرنا چاہئے اور اسی سے دعا کرنی چاہئے کہ وہ حق کے ساتھ فیصلہ کرے اور حق کو دنیا میں پھیلائے۔

سورۃ الحج

نام:

اس سورت کا نام اَلْحَجّ ہے اور اس میں 10 رکوع اور 78 آیتیں ہیں۔ اور اس کا نام اَلْحَجِّ اس حکم سے لیا گیا ہے جو حج کے متعلق اس سورت میں دیا گیا ہے۔ حج ارکانِ اسلام میں سے چوتھا رکن ہے اور محبت الٰہی میں عاشقانہ رنگ پیدا کر کے اسے اس کی ترقی کے کمال تک پہنچاتا ہے اور محبت الٰہی جب کمال کو پہنچتی ہے تو انسان اپنا سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لیے قربان کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ جان بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں دے دیتا ہے اور یہی ضرورت اس وقت پیش آئی تھی۔ اس لیے کفار نے مسلمانوں کو تلوار کے ساتھ نیست و نابود کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسی مناسبت سے اس سورت کا نام اَلْحَجِّ رکھا ہے۔

خلاصہ مضمون:

اس سورت کی ابتدا ﴿زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ﴾ کے ذکر سے ہوتی ہے۔ جس میں

① حق کی مخالفت کرنے والی قوم کی تباہی کا بھی ذکر ہے اور پھر بتایا ہے کہ محاسبہ اعمال ضروری ہے۔

② دوسرے رکوع میں بتایا کہ حق کی نصرت یقینی ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اس نصرت کو روک نہیں سکتی۔

③ تیسرے رکوع میں اہل حق کے نیک انجام کا ذکر کر کے بتایا ہے کہ انہیں خانہ کعبہ سے روکا گیا ہے اور مقام حرمت میں ان پر ظلم کیا گیا۔

④ چوتھے میں خانہ کعبہ کی ابتدا کا ذکر کر کے فرضیت حج کا ذکر کیا ہے۔

⑤ پانچویں میں قربانی کی اصل غرض بتائی۔ اس لیے کہ حج میں قربانی کرنی ضروری ہے۔

⑥ چھٹے میں مضمون کا انتقال ضرورت جنگ کی طرف کیا۔ جس کے لیے اعلیٰ درجہ کی قربانیوں کی ضرورت تھی۔ اور جس کا موقعہ اب آ چکا تھا۔

⑦ ساتویں میں اعدائے حق اور ان کے انجام کا ذکر کیا۔

⑧ آٹھویں میں بتایا کہ مومن کامیاب ہوں گے۔

⑨ نویں میں بتایا کہ توحید ایک مضبوط اصول ہے جس کی دنیا کی سب قوموں کو تعلیم دی گئی اور اب یہ دین توحید کی طرف ہی بلاتا ہے اور آخری رکوع میں شرک کی کمزوری اور بے بنیادی کا ذکر کر کے مسلمانوں کو بشارت دی اور ساتھ ہی سمجھایا کہ کامیابی کا انحصار

اٰیَاتُهَا 78 (22) سُوْرَةُ الْحَجِّ مَدَنِيَّةٌ (103) رُكُوْعَاتُهَا 10

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ①

اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو اس گھڑی کا زلزلہ ایک بڑی چیز ہے۔ (2197)

اس بات پر ہے کہ اعلائے کلمۃ اللہ پر پورا زور لگاؤ۔

تعلق:

پچھلی سورت سے اس کا تعلق یوں ہے کہ اس میں انبیاء کی کامیابی اور ان کے اعدا کی ہلاکت کا عام ذکر تھا۔ یہاں اس بات کو رسول اللہ ﷺ کے متعلق بیان فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ تمہیں بھی اپنے اعدا سے نجات دی جائے گی۔ مگر اس کے لیے جنگوں کی ضرورت پیش آئے گی۔

زمانۂ نزول:

بعض لوگوں نے اس سورت کو مدنی قرار دیا ہے اور بعض نے اسے بکلی مکی قرار دیا ہے اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت ہے کہ سوائے ﴿هٰذٰنِ خَصْمٰنِ﴾ والی چار آیات کے یعنی آیت 19 سے 22 تک کے یہ سورت مکی ہے۔ اور ان چار کو مدنی کہنا بھی اس وجہ سے ہے کہ وہ خصمان سے مراد جنگ بدر میں بالمقابل دو فریقوں کو لیتے ہیں۔ مگر اس کے لیے کوئی سند نہیں لائے۔ البتہ اس سورت میں جنگ کی اجازت سے اور ہجرت کے ذکر سے یہ یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکہ کے آخری ایام کی ہے۔ اور ممکن ہے کہ بعض آیات کا نزول بعد ہجرت ہوا ہو۔

2197- ﴿زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ﴾ کیا چیز ہے؟ مفسرین نے اختلاف کیا ہے کہ قیامت سے پہلے ہے یا قیامت یعنی مردوں کے جی اٹھنے کے بعد، روایات دونوں قسم کی ہیں۔ اور بعض نے اسے قبل قیامت قرار دے کر [اَشرَاطُ السَّاعَةِ] میں لکھا ہے اور روح المعانی میں ہے کہ قیامت سے پیشتر ایک زلزلہ عظیم کی خبر بہت سے آثار میں پائی جاتی ہے اور اسے ﴿زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ﴾ اس لیے کہا کہ اس کے قرب میں اور اس کے نشانوں میں سے ہوگا۔ اور بعض احادیث کی رو سے اس کا وقوع مردوں کے جی اٹھنے کے بعد ہے، اور ابن جریر نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ مگر مردوں کے جی اٹھنے کے بعد حمل والی عورتیں اور دودھ پلانے والی عورتیں کہاں ہوں گی۔ وہ دوسری آیات قرآنی جن میں زلزلہ کا ذکر ہے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ زلزلہ وہ ہے جس سے زمین تباہ ہو جائے گی، مثلاً ﴿وَّ حُمِلَتِ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۙ﴾ [الحاقة: 14:69] ''اور زمین اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے پھر ایک ہی مرتبہ ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے۔'' اور ﴿اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۙ﴾ [الواقعة: 4:56] ''جب زمین سخت

يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَ تَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَ تَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَ مَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَ لٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ۝۲

جس دن تم اسے دیکھو گے ہر روز دودھ پلانے والی (بدحواس ہو کر) اسے چھوڑ دے گی جسے دودھ پلاتی تھی اور ہر حمل والی اپنا حمل ڈال دے گی اور تو لوگوں کو متوالے دیکھے گا، حالانکہ وہ متوالے نہیں ہوں گے۔ لیکن اللہ کا عذاب سخت ہے۔ (2198)

حرکت سے ہلے گی۔'' کے بعد گو ﴿كُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ۝﴾ آتا ہے اور وہ تین قسم قیامت میں ہوں گے۔ مگر اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ قیام قیامت کے بعد زلزلہ ہوگا بلکہ پہلے زلزلہ عظیم آ کر یہ نظام تباہ ہو جائے گا پھر قیامت قائم ہو کر لوگ تین گروہ ہو جائیں گے۔ اور ﴿اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝﴾ [الزلزال: 1:99] ''جب زمین اپنے بھونچال سے ہلائی جائے گی۔'' سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ زلزلہ کے ذکر کے بعد آتا ہے ﴿يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۝﴾ [الزلزال: 6:99] ''اس دن لوگ الگ الگ ہو کر نکل پڑیں گے کہ انہیں ان کے عمل دکھائے جائیں۔'' تو گویا اس سب کو ایک یوم قرار دے کر فرمایا کہ پہلے زلزلہ سے اس نسل انسانی کا خاتمہ ہو جائے گا پھر مردے اٹھیں گے تاکہ اپنے اعمال کے نتائج دیکھیں۔ پس ﴿زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ﴾ قبل قیامت ہی ہے۔ مگر اس طرح پر کہ وہی قیامت کا لانے والا ہے۔ البتہ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ساعتیں تین ہیں [دیکھو نمبر: 108] اور لفظ سَاعَةٍ کی تشریح کے لیے [دیکھو نمبر: 931] یعنی صغریٰ، وسطیٰ، کبریٰ۔ صغریٰ جو ہر انسان کی موت سے تعلق رکھتی ہے اس کا ذکر تو یہاں نہیں ہو سکتا کیونکہ خطاب سب لوگوں کو ہے۔ اور وسطیٰ اور کبریٰ دونوں قیامتوں پر یہ الفاظ صادق آتے ہیں۔ اور ساعت وسطیٰ کی صورت میں لفظ زلزلہ سے مراد زمین کا کانپنا نہیں بلکہ اھوال و شدائد اور جنگیں وغیرہ ہیں۔ [دیکھو نمبر: 273] اور زلزلہ سے یہاں مجازاً اھوال و شدائد کا آنا مفسرین نے بھی قبول کیا ہے۔ [اَلزِّلْزَالُ وَمَا يَحْدُثُ لِلنُّفُوسِ مِنَ الرُّعْبِ وَالفَزَعِ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا] یعنی زلزلہ سے مراد دلوں میں رعب اور گھبراہٹ کا پیدا ہونا ہے اور یہاں اس ساعت وسطیٰ کی طرف یقیناً اشارہ ہے۔ اس لیے کہ پچھلی سورت کا خاتمہ اس ساعت وسطیٰ یعنی نشان ہلاکت کے ذکر پر ہوا تھا۔ تو اب کھول کر اس کے اھوال سے ڈرایا ہے اور ساعت وسطیٰ، ساعت کبریٰ کے لیے بطور ایک گواہ کے ہے۔ اس لیے اس کے قیام سے تقویٰ اللہ کی طرف دل مائل بھی ہوتے ہیں۔ اور اسی سورت میں آگے چل کر جنگ کی اجازت بھی دی ہے۔ پس یہ تمام قرائن بتاتے ہیں کہ یہاں خصوصیت سے اشارہ ایک قوم کی ساعت وسطیٰ کی طرف ہے۔

2198- ﴿تَذْهَلُ﴾۔ ذَهل ایک چیز کا چھوڑ دینا ہے خواہ ارادۃً چھوڑی جائے یا کوئی دوسرا شغل اس سے روک دے۔ (ل) یا ایسی بات جس سے حزن اور نسیان پیدا ہو۔ (غ)

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ يَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ۙ﴿۳﴾

اور لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو علم کے بغیر اللہ کے بارے میں جھگڑتا ہے اور ہر سرکش شیطان کے پیچھے چلتا ہے۔

كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَ يَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿۴﴾

اس کی نسبت لکھا جا چکا ہے کہ جو کوئی اسے دوست بناتا ہے وہ اسے گمراہ کر دیتا ہے اور اسے جلتی ہوئی آگ کے عذاب کی طرف لے جاتا ہے۔ (2199)

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ؕ

اے لوگو! اگر تمہیں جی اٹھنے میں شک ہے، تو (غور کرو کہ) ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر لوتھڑے سے، پھر گوشت کے ٹکڑے سے، جو (کبھی) پورا بن جاتا ہے اور (کبھی) ادھورا رہتا ہے تاکہ تمہارے لیے کھول کر بیان کر دیں۔ (2200)

﴿مُرْضِعَةٍ﴾۔ رَضَعَ کے لیے [دیکھو نمبر: 302] مُرْضِعٌ اور مُرْضِعَةٌ میں یہ فرق کیا گیا ہے کہ مُرْضِعٌ بلحاظ صفت دودھ پلانے والی ہے اور مُرْضِعَةٌ وہ ہے جو فی الواقع دودھ پلا رہی ہو یعنی جس کی چھاتیاں بچہ اس وقت چوس رہا ہوں۔ (ل)

گھبراہٹ کی شدت کی یہ تصویر کھینچی ہے۔ کیونکہ ماں کا دودھ پیتے ہوئے بچہ کو چھوڑنا یا حمل والی کا حمل گر جانا سخت ترین غم سے ہی ہو سکتا ہے اور سُکٰرٰی سے مراد یہاں شراب سے بدمست ہے۔ یعنی بدحواس ایسے ہوں گے اور عقل پر اس قدر پردہ پڑا ہوا ہوگا کہ گویا شراب سے بدمست ہیں۔ حالانکہ وہ بدحواسی شراب سے نہ ہوگی بلکہ شدت عذاب سے ہوگی۔

2199- ہر دو آیات عام ہیں۔ نضر ابن الحرث ہو یا ابوجہل یا اور کوئی ان کا مثیل۔ بلکہ ابوجہل اور اس کے مثیلوں کا ذکر شیطان مرید کے لفظ میں ہے اور اتباع کرنے والے عام لوگ ہیں اور شیطان مرید سے رؤسائے کفار مراد ہونا مفسرین نے بھی مانا ہے۔ (ر) اور اتباع کا لفظ انہی کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ عَلَيْهِ کی ضمیر اسی شیطان مرید کی طرف ہے کہ اس کی دوستی سے انجام کار قلب کو راحت نہیں ملتی بلکہ جلن ہی پیدا ہوتی ہے۔

2200- ﴿عَلَقَةٍ﴾۔ عَلَقٌ کے اصل معنی کسی چیز کو مضبوط پکڑ لینا یا تعلق پیدا کر لینا ہیں۔ اور عَلَقَةٍ وہ خاص حالت ہے جس سے بچہ بنتا ہے۔ (غ) اور اس کے معنی عموماً خون کا لوتھڑا کیے جاتے ہیں۔

﴿مُّضْغَةٍ﴾ گوشت کے ٹکڑے کو کہتے ہیں اس انداز سے جو چبایا جا سکے اور جنین کی اس حالت کا نام ہے جو علقہ کے بعد ہوتی ہے۔

﴿مُّخَلَّقَةٍ﴾۔ خلق کے لیے [دیکھو نمبر: 33 و 431] اور مُّخَلَّقَةٍ سے مراد [تَامَّةَ الْخَلْقِ] ہے یعنی جس کی پیدائش کمال کو پہنچ گئی۔

وَ نُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ وَ تَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ

اور ہم جو چاہتے ہیں رِحموں میں ایک مقررہ وقت تک ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر تمہیں بچہ بنا کر نکالتے ہیں۔ پھر (تمہیں بڑھاتے ہیں) تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو اور تم میں سے کوئی ایسا ہے جو وفات پا جاتا ہے اور کوئی تم میں سے وہ ہے جو نکمی عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے تاکہ علم حاصل کرنے کے بعد اسے کچھ علم نہ رہے۔ (2201)

اور ایک قول ہے کہ مُّخَلَّقَةٍ وہ ہے جس کی خلق ظاہر ہوگئی اور ﴿غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ﴾ وہ ہے جس کی تصویر نہیں بنی اور [قِدحٌ مُخَلَّقٌ] اس تیر کو کہتے ہیں جو برابر اور نرم کیا گیا ہو۔ (ل)

پیدائش جسمانی کے مختلف مراتب:

جو لوگ موت کے بعد جی اٹھنے کو امر مستعبد خیال کرتے ہیں اور اس بنا پر اس میں شک کرتے ہیں کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ ان کو بتایا ہے کہ انسان کی پہلی پیدائش پر غور کریں۔ پہلی اس کی حالت مٹی کی ہوتی ہے گویا ہر انسان کی پیدائش مٹی سے شروع ہوتی ہے، اس مٹی سے نُطفَةً بنتا ہے۔ کیونکہ مٹی سے غذائیں، غذاؤں سے خون صالح، خون صالح سے منی بنتی ہے۔ یہ انسان کی دوسری حالت ہے۔ پھر یہ نطفہ رحم مادر سے تعلق پیدا کرتا ہے اور اس کی حالت عَلَقَةٌ کی ہو جاتی ہے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ عَلَقَةٌ اس حالت کا نام اسی لیے رکھا گیا ہے کہ اس میں ایک نیا تعلق پیدا ہو جاتا ہے جو نطفہ رحم مادر سے تعلق پیدا نہیں کرتا وہ بچہ نہیں بنتا۔ پس علقہ ماں کے پیٹ میں بچہ کی ابتدائی حالت ہے۔ پھر یہ نشوونما پاتا ہوا ایک گوشت کا ٹکڑا بن جاتا ہے اور مُّخَلَّقَةٍ اور ﴿غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ﴾ سے صحیح مراد وہی ہے جو مجاہد نے کہا ہے۔ یعنی مُّخَلَّقَةٍ وہ ہے جس کی مدت حمل پوری ہو جاتی ہے اور ﴿غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ﴾ وہ ہے جو ادھورا ہو کر ناتمام گر جاتا ہے۔ (ر) اور یہ مراتب اس لیے بیان کیے کہ تا انسان پر واضح ہو جائے کہ اگر ایسے حالات میں سے ایک خوبصورت انسان بن سکتا ہے تو اعمال سے اس کو ایک اور زندگی ملنا کون سا مستبعد امر ہے۔ اور دوسری طرف یہ خلق جسمانی کے مراتب خلق روحانی کے مراتب کے مقابل پر ہیں۔ یعنی اعمال انسانی پہلے اسی طرح پراگندہ ہوتے ہیں جس طرح انسان کے اجزا مٹی میں۔ پھر نطفہ کی حالت میں آ کر ان اعمال میں ایک غیر محسوس طریق پر زندگی پیدا ہوتی ہے۔ مگر یہ زندگی نطفہ کی طرح قابل نشوونما نہیں ہوتی، جب تک کہ ان اعمال کا تعلق اللہ تعالیٰ سے نہ ہو۔ پھر وہ تعلق ناقص ہوتا ہے کبھی کامل۔

2201- طِفْل بچہ کو کہتے ہیں جب تک وہ نرم و نازک ہو۔ اطفال جمع ہے۔ ﴿وَ اِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ﴾ [النور: 59:24] ''اور جب لڑکے

اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ وَ اَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيْجٍ ۝۵

اور تُو زمین کو بے حس پڑی دیکھتا ہے۔ پھر جب ہم اس پر پانی اتارتے ہیں تو وہ لہلاتی ہے اور ابھرتی ہے اور ہر قسم کی خوشنما روئیدگی اُگاتی ہے۔ (2202)

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّهٗ يُحْىِ الْمَوْتٰى وَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝۶ۙ

یہ اس لیے کہ اللہ ہی حق ہے اور کہ وہی مُردوں کو زندہ کرتا ہے اور کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (2203)

وَّ اَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِى الْقُبُوْرِ ۝۷

اور کہ وہ گھڑی آنے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں اور یہ کہ اللہ انہیں اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِى اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ لَا هُدًى وَّ لَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝۸ۙ

اور لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جو اللہ کے بارے میں جھگڑتا ہے حالانکہ نہ علم رکھتا ہے اور نہ ہدایت اور نہ روشنی دینے والی کتاب۔

بلوغ کو پہنچ جائیں۔''

اس حصہ میں بتایا کہ بچہ ہونے سے انسان کس طرح ترقی کر کے اپنے جسمانی کمال کو پاتا ہے۔ پھر اپنے روحانی کمال کو حاصل کرتا ہے اور کمال جسمانی کے بعد پھر اس میں زوال بھی آنے لگتا ہے جو اس کے مخلوق ہونے پر دلالت ہے۔ اور یہ تنزل کی حالت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ انسان پھر ایک بچہ کی طرح ہو جاتا ہے، اور سب کچھ حاصل کیا ہوا پھر بھول جاتا ہے۔

2202- ﴿هَامِدَةً﴾۔ [هَمَدَتِ النَّارُ] کے معنی ہیں آگ بجھ گئی اور [اَرْضٌ هَامِدَةٌ] اس زمین کو کہتے ہیں جس میں سبزی کوئی نہ ہو۔ (غ)

بَهِيْجٍ۔ بَهْجَة رنگ کی خوبصورتی اور خوشی کے ظاہر ہونے کو کہا جاتا ہے ﴿حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ﴾ [النمل: 60:27] ''خوش نما باغ اگائے۔'' (غ)

اس روحانی زندگی کے ذکر کو جو پہلے حصہ میں بطور اشارہ چلا آیا ہے یہاں مردہ زمین اور پانی کا ذکر کر کے زیادہ واضح کیا ہے۔

2203- گویا اللہ تعالیٰ کے ان قوانین سے معلوم ہوا کہ اللہ حق ہے اور جس طرح وہ مردہ زمین کو بارش سے زندہ کرتا ہے اسی طرح مردہ دلوں کو روحانی بارش یعنی وحی الٰہی سے زندہ کرتا ہے۔ ﴿يُحْىِ الْمَوْتٰى﴾ سے یہاں یہی مراد ہے۔ قیامت میں مُردوں کے اٹھانے

ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّ نُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝۹

اپنی کروٹ موڑ کرتا کہ اللہ کی راہ سے بہکا دے۔ اس کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور ہم اسے قیامت کے دن جلنے کا عذاب چکھائیں گے۔ (2204)

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝۱۰ ع 1 10 8

یہ اس وجہ سے جو تیرے ہاتھوں نے آگے بھیجا اور اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ اِطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَ اِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۝۱۱

اور لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جو کنارے پر رہ کر اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ سو اگر اسے کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو اس پر مطمئن ہو جاتا ہے۔ اور اگر اسے تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے منہ پر الٹا پھر جاتا ہے۔ دنیا اور آخرت میں گھاٹے میں رہا۔ یہی کھلا گھاٹا ہے۔ (2205)

کا ذکر اگلی آیت میں الگ ہے۔ یعنی ساعت کا آنا اور جو قبروں میں ہیں ان کا اُٹھ کھڑا کیا جانا۔

2204- ﴿ثَانِيَ عِطْفِهٖ﴾۔ ثنی کے لیے [دیکھو نمبر: 1442] عَطْف کسی چیز کے متعلق کہا جاتا ہے جب اس کی ایک طرف دوسری پر دوہرا دی جائے۔ اور عِطْف انسان کی جانب اس کے سر سے لے کر بن ران تک ہے۔ اور [ثَنَى عِطْفِهٖ] کے معنی ہیں اعراض کیا، الگ ہو گیا۔ جیسے ﴿نَاٰ بِجَانِبِهٖ﴾ [بنی إسرائیل: 83:17] ''اور پہلو تہی کرتا ہے۔'' (غ)

2205- عَلٰى حَرْفٍ۔ حرف کے معنی کنارہ یا طرف بیان ہو چکے ہیں [دیکھو نمبر: 100]۔ اور کہا جاتا ہے کہ [فُلَانٌ عَلٰى حَرْفٍ مِنْ اَمْرِهٖ] یعنی اپنے معاملہ میں وہ ایک کنارہ پر کھڑا ہے۔ گویا انتظار کر رہا ہے کہ اگر آرام اور سکھ ملتا رہے تو خیر اور ذرا تکلیف پہنچی تو فوراً دوسری طرف مائل ہو گیا اور زجاج نے ﴿عَلٰى حَرْفٍ﴾ کے معنی [عَلٰى شَكٍّ] کیے ہیں، یعنی شک کی حالت میں رہ کر۔ (ل)

﴿عَلٰى وَجْهِهٖ﴾ سے مراد ہے کہ وہ دائیں بائیں التفات کیے بغیر الٹا پھر جائے گا۔ اور بعض نے اسے بھاگ جانے سے کنایہ سمجھا ہے۔ (ر)

یہ ایسے لوگوں کا ذکر ہے جو دین کو دین کی خاطر قبول نہیں کرتے۔ بلکہ دنیوی فوائد کے لیے قبول کرتے ہیں۔ اس لیے جب تک

يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَ مَا لَا يَنْفَعُهٗ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۲﴾

اللہ کو چھوڑ کر اسے پکارتا ہے جو نہ اسے نقصان دے سکتا ہے اور نہ اسے نفع پہنچا سکتا ہے، یہ پرلے درجے کی گمراہی ہے۔

يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ؕ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَ لَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴿۱۳﴾

اسے پکارتا ہے جس کا نقصان اس کے نفع سے قریب تر ہے۔ کیا ہی برا دوست اور کیا ہی برا رفیق ہے۔ (2206)

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۱۴﴾

اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور اچھے عمل کرتے باغوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ اللہ جو ارادہ کرتا ہے کر گزرتا ہے۔

مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى

جسے یہ خیال ہے کہ اللہ اس (رسول) کی دنیا اور آخرت میں مدد نہیں کرے گا، تو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو کسی ذریعہ سے

کچھ فائدہ پہنچتا رہا خوش رہے لیکن دین کی خاطر بڑی بڑی تکلیفیں بھی اٹھانی پڑتی ہیں۔ بخاری میں ہے کہ ایک شخص مدینہ میں آتا پھر اس کی عورت لڑکا جنتی اور اس کی گھوڑیاں بچے جنتیں تو کہتا یہ اچھا دین ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو کہتا یہ بڑا برا دین ہے۔ ایسے لوگ اعراب میں سے تھے جنہیں دین کی خاطر کوئی دکھ اٹھانا نہیں پڑا۔ ورنہ ابتدائی مسلمانوں کا بیشتر حصہ وہ تھا جنہوں نے دین کی خاطر سر بھی دے دیئے۔ اور یہاں یہ سمجھایا ہے کہ حق کو حق کی خاطر قبول کرنا چاہئے نہ اس لیے کہ اس سے کوئی دنیوی فائدہ پہنچتا یا نقصان دور ہوتا ہے۔

2206- پہلی آیت میں ذکر ہے کہ وہ اسے بلاتا ہے جو نہ اسے نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔ اور دوسری میں ہے کہ اسے بلاتا ہے جس کا نقصان اس کے نفع سے قریب تر ہے۔ اور ان دونوں باتوں میں تناقض سمجھا گیا ہے۔ حالانکہ تناقض فی الحقیقت کوئی نہیں، معبود باطل فی الحقیقت نہ نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔ یعنی نہ وہ کسی کا کچھ بنا سکتا ہے نہ کچھ بگاڑ سکتا ہے۔ مگر اس کی عبادت، عبادت کرنے والے کو یقیناً نقصان پہنچاتی ہے اور عبادت کرنے والا اس میں نفع سمجھتا ہے۔ تو یہ نقصان اس کے فرضی نفع سے قریب تر ہے۔ یعنی نفع کی امید تو اسے آئندہ کے لیے ہے اور نقصان اس کے اخلاق کو جب وہ اپنے آپ کو ایک مخلوق کے سامنے گراتا ہے، فوراً پہنچ جاتا ہے۔

السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ﴿۱۵﴾	آسمان پر لے جائے پھر اسے کاٹ دے، پھر دیکھے کہ کیا اس کی تدبیر اس چیز کو دور کر دیتی ہے جو اسے غصہ میں لاتی ہے۔(2207)
وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿۱۶﴾	اور اسی طرح ہم نے اسے اتارا (کہ) کھلی آیتیں (ہیں) اور اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الصّٰبِـِٔيْنَ وَ النَّصٰرٰى وَ الْمَجُوْسَ وَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۷﴾	جو ایمان لائے اور وہ جو یہودی ہیں اور صابی اور نصاریٰ اور مجوس اور مشرک ہیں، اللہ ان کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا۔ اللہ ہر چیز پر گواہ ہے۔(2208)

2207- يَقْطَعْ۔ قَطع کے معنی کسی چیز کا علیحدہ کر دینا ہیں۔ خواہ وہ مادی چیز ہو جو آنکھ سے دیکھی جا سکے اور خواہ بصیرت سے معلوم کی جاتی ہو۔ (غ) اور یہاں حَبل یعنی رستہ کا قطع کرنا بھی مراد لیا گیا اور اَجل یعنی زندگی کا قطع کرنا بھی۔ (غ)

حق کی نصرت کو کوئی نہیں روک سکتا:

﴿مَنْ يَّنْصُرُهٗ﴾ میں ضمیر ہُ کی رسول اللہ ﷺ کے لیے ہے۔ اور یہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مفسرین سے مروی ہے۔ (ر) اور خود قرینہ بھی یہی چاہتا ہے۔ اس لیے کہ ذکر رسول اللہ ﷺ سے جھگڑنے والوں کا ہے۔ ﴿فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ﴾ کے ایک معنی (سَبَبٍ کے معنی رسہ اور سَمَآء کے معنی [سَقْفَ بَيْتٍ] یعنی گھر کی چھت لے کر اور يَقْطَعْ کے معنی يَخْتَنِقَ یعنی گلا گھونٹ لے کر) یہ کیے گئے ہیں کہ چھت سے رسہ لٹکا کر پھانسی کے لیے یعنی نصرت تو بہرحال آئے گی۔ مگر چونکہ سَبَبٍ کے معنی کوئی ذریعہ ہیں جس سے کسی چیز تک پہنچا جائے [دیکھو نمبر: 204]۔ اس لیے یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ نصرت الٰہی تو رسول کے لیے آئے گی جو شخص اسے روکنا چاہتا ہے اسے چاہئے کہ کسی ذریعہ سے آسمان پر پہنچ کر یعنی اللہ تعالیٰ تک رسائی حاصل کر کے اس نصرت کو قطع کر دے۔ مگر کسی کی کوشش کچھ نہیں کر سکتی اور رسول کے لیے نصرت کا آنا یقینی ہے۔ کسی کے غیظ و غضب سے یہ سلسلہ قطع نہیں ہو سکتا۔

2208- ﴿اَلْمَجُوْسَ﴾ وہ لوگ جو خالق نور اور خالق ظلمت الگ الگ مانتے ہیں اور آتش پرست ہیں۔ حدیث میں [يُمَجِّسَانِهٖ] آیا ہے۔ یعنی اسے مجوسیوں کے دین کی تعلیم دیتے ہیں۔ (ل)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ وَ النُّجُوْمُ وَ الْجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ وَ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَ كَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَ مَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ؕ ﴿۱۸﴾ السجدة ۶

کیا تو نے غور نہیں کیا کہ اللہ کی ہی فرمانبرداری کرتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں۔ اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جاندار اور بہت سے لوگ (بھی) اور بہت (ایسے ہیں کہ) عذاب ان پر لازم ہو گیا ہے۔ اور جسے اللہ ذلیل کرے تو کوئی اسے عزت دینے والا نہیں۔ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔(2209)

هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ز فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ

یہ دو جھگڑنے والے ہیں جنہوں نے اپنے رب کے بارے میں جھگڑا کیا، سو جو کافر ہیں ان کے لیے آگ کے

اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ اختلاف عقائد اس دنیا میں رہے گا اور اس کا فیصلہ قیامت میں ہی ہوگا۔ یہ نہیں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان ادیان کو بکلی مٹا دے۔

2209- سجدہ کے لیے [دیکھو نمبر: 52]۔ بعض مخلوق صرف سجدہ تسخیری کرتی ہے اور بعض یعنی انسان دوسری مخلوق کے ساتھ سجدہ تسخیری میں شامل ہے۔ اور سجدہ اختیاری اس کا امتیاز ہے۔ اس لیے پہلے ﴿مَنْ فِي الْاَرْضِ﴾ میں انسان بھی شامل ہے اور سجدہ تسخیری میں اس کا بھی ذکر ہے اور اس کے بعد جو سورج، چاند، درختوں وغیرہ کا ذکر کیا تو یہ صرف یہ بتانے کے لیے ہے کہ یہی چیزیں جن کی بعض لوگ عبادت کرتے ہیں یہ خود اللہ تعالیٰ کے قانون میں جکڑی ہوئی اور اس کے احکام کی پابند ہیں۔ جتنی چیزوں کا یہاں نام لیا ہے ان سب کی عبادت کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ درختوں اور چارپایوں کی بھی لوگوں نے عبادت کی ہے۔ اور ﴿كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ﴾ میں سجدہ اختیاری کا ذکر ہے۔ مگر اس سے بھی لازماً مراد صرف زمین پر ماتھے کا رکھنا نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی فرمانبرداری ہے۔ اور ان لوگوں کا ذکر جو احکام الٰہی کی فرمانبرداری نہیں کرتے ﴿كَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ﴾ میں کیا۔ یعنی انہوں نے سجدہ اختیاری سے انکار کر کے اپنے آپ کو سزا کا مستوجب بنا لیا اور آخر کار پھر بھی اللہ تعالیٰ کے قانون سے باہر نہ نکل سکے۔ ہاں ﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ کی فرمانبرداری اور عبادت انسان کو ذلیل کرنے والی شے ہے۔ اور اللہ کی فرمانبرداری اسے عزت دینے والی ہے۔

نَّارٍ ؕ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ۚ﴿۱۹﴾

کپڑے قطع کیے گئے ہیں، ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا۔(2210)

يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَ الْجُلُوْدُ ؕ﴿۲۰﴾

اس سے جو کچھ ان کے پیٹوں میں ہے اور کھالیں گل جائیں گی۔(2211)

وَ لَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴿۲۱﴾

اور ان کے لیے لوہے کے گرز ہوں گے۔(2212)

كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ

جب کبھی ارادہ کریں گے کہ اس سے غم کے مارے نکل

2210- ﴿يُصَبُّ﴾۔ صَبّ پانی کا اوپر سے گرانا ہے۔ ﴿اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا﴾ [عبس: 25:80] ''(پہلے) ہم خوب پانی برساتے ہیں۔'' ﴿فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ﴾ [الفجر: 13:89] ''سو تیرے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا چلایا۔'' (غ)

﴿هٰذٰنِ خَصْمٰنِ﴾ کے متعلق قیس کی روایت سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے بخاری میں ہے کہ بدر کے دن سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور آپ کے دو ساتھیوں اور عتبہ اور اس کے دو ساتھیوں کے حق میں یہ نازل ہوئی۔ مگر یہ سورت مکی ہے اور صحیح یہی ہے کہ دو جھگڑنے والوں سے مراد مومنوں اور کافروں کے فریق ہیں۔ (ر) جن میں سے ایک فریق حق کو نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا ہے اور دوسرا فریق اللہ تعالیٰ کی توحید اور نیکی کو دنیا میں پھیلانا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس کی وضاحت [آیت: 25] میں کر دی ہے۔ اور آگ کے کپڑے قطع کرنا بطور مجاز ہے۔ کیونکہ کپڑے تو انسان کی پردہ پوشی اور زینت کے لیے ہوتے ہیں۔ ان کی پردہ پوشی اور زینت کا کام آگ دے گی۔ ایسا ہی سروں کے اوپر سے کھولتا ہوا پانی ڈالنا اس وجہ سے ہے کہ وہ سر کو اللہ تعالیٰ کے آگے نیچا نہ کرتے تھے۔

2211- ﴿يُصْهَرُ﴾۔ صَهْر۔ چربی کا پگھلانا ہے۔ اور صِهْر بیٹی اور بہن کے خاوند کو کہتے ہیں۔ اور عورت کے اہل بیت اَصْهَارٌ کہلاتے ہیں۔ ﴿فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّ صِهْرًا﴾ [الفرقان: 54:25] ''پھر اسے نسب اور سسرال (والا) بنایا۔'' (غ)

عذاب کی غرض:

وہ آلائشیں جو ان کے اندر جمع ہو گئی ہیں وہ بھی نکال دی جائیں گی۔ اور جُلُوْد یعنی باہر کا حصہ بھی صاف کر دیا جائے گا۔

2212- مَّقَامِعُ۔ مَقمَع کی جمع ہے۔ جس سے مار کر مطیع کیا جاتا ہے [ما يَضرَبُ بِه وَ يُذَلَّلُ]۔ اور [قَمَعْتُهُ فَانْقَمَعَ] کے معنی ہیں میں نے اسے روکا، سو وہ رُک گیا۔ (غ) اور قَمع کے اصل معنی ہی مغلوب اور مطیع کرنا ہیں۔ اور مَقْمَعَ گُرز یا کوڑے کو کہا جاتا ہے۔ (ل)

معلوم ہوا کہ اس کی اصل غرض بھی ان کی سرکشی کے مادہ کو دور کرنا اور ان میں اطاعت اور فرمانبرداری کی روح پیدا کرنا ہے۔

ع 12 9 اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۲۲﴾

جائیں، اس میں لوٹائے جائیں گے اور (کہا جائے گا) جلنے کا عذاب چکھو۔ (2213)

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا ؕ وَ لِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿۲۳﴾

اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں، باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ ان میں انہیں سونے کے کڑے اور موتی پہنائے جائیں گے اور ان کا لباس ان میں ریشم ہوگا۔

وَ هُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚۖ وَ هُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ﴿۲۴﴾

اور ان کو پاک بات کی طرف ہدایت کی گئی اور انہیں اس راہ کی ہدایت کی گئی ہے جس کی تعریف کی جاتی ہے۔ (2214)

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ

جو لوگ کفر کرتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور مسجد حرام سے جسے ہم نے سب لوگوں کے لیے یکساں بنایا ہے

2213- **عذاب کی نوعیت:** ﴿مِنْ غَمٍّ﴾ کے معنی دو طرح پر ہو سکتے ہیں۔ یا یہ مِنْهَا سے بدل ہے یعنی اس غم سے باہر نکل جانا جو ان کے لاحق حال ہے۔ گویا بتایا ہے کہ اصل عذاب ان کا وہ غم ہے جو ان کے دلوں کو کھا رہا ہے۔ اور وہی آگ بن کر ان کے جسموں پر محیط ہو جائے گا اور یا ﴿مِنْ غَمٍّ﴾ علت خروج ہے، یعنی اس غم کی وجہ سے نکلنا چاہیں گے جو انہیں ہوگا۔ اور بعض نے غم سے مراد یہاں ڈھانک دینے والا عذاب لیا ہے۔

2214- اس ہدایت سے مراد اس دنیا کی زندگی کی ہدایت ہے اور ﴿الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ﴾ اقرار توحید ہے یا سب اچھی باتوں کا اقرار۔ اور ﴿صِرَاطِ الْحَمِيْدِ﴾ میں اضافت بیانیہ ہے۔ یعنی ایسا رستہ جو محمود ہے اور مراد اس سے ہر قسم کے اچھے فعل ہیں۔ کیونکہ رستہ پر چلنا بذریعہ افعال کے ہے اور بتایا ہے کہ جنت انسان کی پاک باتوں اور اچھے فعلوں سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ اور ﴿صِرَاطِ الْحَمِيْدِ﴾ میں بعض نے الْحَمِيْدِ سے مراد اللہ تعالیٰ کا اسم لیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی صراط سے مراد اس کا بتایا ہوا رستہ یعنی اسلام ہوگا۔

لِلنَّاسِ سَوَآءَ ِۨالْعَاكِفُ فِيْهِ وَ الْبَادِ ؕ وَ مَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۵﴾ ع 3 3 10

(خواہ) اس میں رہنے والا (ہو) اور (خواہ) باہر سے آنے والا، اور جو کوئی اس میں ظلم کے ساتھ ناانصافی کا ارادہ کرے ہم اسے دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ (2215)

2215- اس آیت میں یہ واضح کر دیا ہے کہ یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو شرارت کی راہ سے لوگوں کو حق کے قبول کرنے سے روکتے تھے اور مسجد حرام سے بھی روکتے تھے اور یہ کفار مکہ تھے جن کی اذیت مسلمانوں کے حق میں اس وقت کمال کو پہنچ چکی تھی۔ جس کی وجہ سے مسلمان مکہ کو چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔

مکانات مکہ کی بیع اور کرایہ:

مسجد حرام کی حرمت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ مکہ کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے سب اس میں برابر ہیں۔ تو اس سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ اس میں مکانوں کا کرایہ حاجیوں سے لینا جائز نہیں، اور بعض نے اسی بنا پر وہاں کے مکانات کی بیع کو بھی جائز نہیں رکھا۔ مگر امام شافعی کے نزدیک یہ جائز ہے اور درست بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ یہاں ذکر یہ ہے کہ کفار مسلمانوں کو مسجد حرام سے روکتے ہیں۔ اس کے مقابل پر عَاكِفُ اور بَاد کا برابر ہونا اسی لحاظ سے ہوسکتا ہے کہ اس میں عبادت کرنے سے کسی کو نہ روکا جائے، اور مکانات کا بیع ہونا روایات سے ثابت ہے۔ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے دارالسجن کو خریدا۔ اس میں شک نہیں کہ دوسری طرف بھی بعض روایت ہیں۔ مثلاً ایک شخص نے اپنے گھر کو دروازہ لگایا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ناپسند فرمایا اور کہا کہ تم حاجیوں کو گھر میں جگہ دینے سے روکتے ہو۔ تو اس نے کہا کہ میں نے ان کے اسباب کی حفاظت کے لیے دروازہ لگایا ہے۔ مگر اس سے صرف اسی قدر اخذ ہوسکتا ہے کہ جس کے پاس جگہ ہو اس کا فرض ہے کہ حاجیوں کو آرام دے۔ البتہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جو شخص مکہ کے گھروں کا کرایہ کھاتا ہے وہ اپنے پیٹ میں آگ کھاتا ہے۔ لیکن جس مکان کی بیع جائز ہے اس کے کرایہ کا ناجائز ہونا خلاف اصول ہے۔

﴿وَ مَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ﴾ سے کیا مراد ہے؟ اِلحَاد کے لیے [دیکھو نمبر: 1786] اور [اَلحَدَ فُلَانٌ] کے معنی ہیں [مَالَ عَنِ الْحَقِّ]۔ (غ) حق سے مائل ہو گیا یعنی حق بات کو ترک کر دیا۔ اور خانہ کعبہ کے متعلق الحاد یہ ہے کہ جو اس کی غرض ہے اسے پورا نہ ہونے دیا جائے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تو اسے اپنی عبادت کا گھر اور لوگوں کو مرجع بنایا تو جو شخص اللہ کے نام لینے والوں کو اس سے روکتا ہے وہ اس میں الحاد چاہتا ہے۔ اور بِظُلْمٍ ساتھ بڑھایا ان مظالم کی طرف اشارہ کرنے کے لیے جو مسلمانوں پر ہو رہے تھے۔ اور یہ جو الحاد میں شرک اور احتکار غلہ وغیرہ کو داخل کیا ہے تو یہ چیزیں من وجہٍ الحاد میں داخل ہوسکتی ہیں، مگر اصل غرض یہ نہیں۔

وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّ طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآىِٕفِيْنَ وَ الْقَآىِٕمِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۲۶﴾

اور جب ہم نے ابراہیم کے لیے خانہ (کعبہ) کی جگہ مقرر کردی کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کر اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع (اور) سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک کر۔ (2216)

وَ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ﴿۲۷﴾

اور لوگوں میں حج کے لیے پکار دے، وہ تیری طرف آئیں گے (کچھ) پیدل اور (کچھ) ہر طرح کی دبلی (سواریوں) پر، جو ہر دور کے رستے سے آتی ہوں گی۔ (2217)

2216- بَوَّأَ کے لیے [دیکھو نمبر: 91 ، 508]۔ چونکہ بَاءَ بمعنی رَجَعَ بھی آتا ہے اس لیے بَوَّاْنَا کے معنی دو طرح پر ہو سکتے ہیں۔ ہم نے اس کے لیے مرجع بنایا اور ہم نے اس کو جگہ دی۔ اور زجاج نے معنی کیے ہم نے اسے خانہ کعبہ کی جگہ بتا دی۔

تطہیر خانہ کعبہ:

﴿طَهِّرْ بَيْتِيَ﴾ سے مراد ہے شرک سے پاک کر اور یہ مجاہد سے مروی ہے۔ (ج) اور شرک کے ذکر کے بعد طَهِّرْ کا لانا بتاتا ہے کہ اسی سے پاک کرنا مراد ہے اور پھر طواف و قیام رکوع سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک کرنا بھی یہی ہو سکتا ہے۔ یہی مضمون [البقرة: 125] میں بھی آچکا ہے۔ [دیکھو نمبر: 159]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خانہ کعبہ سے تعلق پر بحث [نمبر: 157-159] میں گزر چکی ہے۔ اور [نمبر: 162] میں بتایا گیا ہے کہ خانہ کعبہ کو کب کب اور کس کس نے بنایا۔ خانہ کعبہ کا موجودہ طول و عرض وغیرہ حسب ذیل ہے۔ بلندی 27 ہاتھ، طول 25 ہاتھ، عرض 20 ہاتھ۔

2217- ﴿ضَامِرٍ﴾۔ ضُمْر اور ضُمُر، هَذَالٌ یعنی دبلا پن کو کہتے ہیں اور اَضْمَرَ کے معنی ہیں ایک چیز کو مخفی کیا۔ (ل) اور اسی سے ضمیر ہے۔ اس لیے کہ اس پر اطلاع پانا کچھ مشکل ہوتا ہے۔ یعنی وہ چیز صاف طور پر بیان نہیں ہوتی۔ اور ضَامِرٌ تھوڑے گوشت والے گھوڑے وغیرہ کو کہا جاتا ہے جس کی گوشت کی کمی اس کے زیادہ کام کرنے کا نتیجہ ہو نہ هَذَالٌ سے۔ (غ) اور ضَامِرٌ کے لفظ میں اشارہ ہے کہ لوگ بڑی بڑی مشقتیں اٹھا کر خانہ کعبہ کی زیارت کو آئیں گے۔

﴿عَمِيْقٍ﴾۔ عُمْق اس بعد کو کہتے ہیں جو نیچے ہونے کے لحاظ سے ہو اور یہاں عَمِيْقٍ مطلق بعید کے معنی میں ہے۔ (غ)

﴿اَذِّنْ﴾ میں خطاب عموماً حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مانا گیا ہے۔ گویا ارکان حج حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قائم کردہ ہیں اور خانہ کعبہ کا

لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَ يَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ﴿۲۸﴾

تا کہ اپنے فائدہ کی جگہوں پر حاضر ہوں۔ اور مقرر دنوں میں اللہ کے نام کا ذکر اس پر کریں، جو اس نے انہیں چار پائے جانور دیئے ہیں۔ سو ان سے کھاؤ اور تکلیف والے محتاج کو کھلاؤ۔ (2218)

حج ان کے ذریعہ ہی مقرر ہوا۔ اور اَذِّنْ میں اسی قسم کا اعلان ہے جیسا ﴿وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖٓ﴾ میں۔ اور یہ خیالات کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آواز دنیا میں پہنچانے کے لیے پہاڑ نیچے کیے گئے اور بستیاں بلند کی گئیں یا اصلاب اور ارحام میں آواز پہنچائی گئی، محض خیالات ہی ہیں۔ جس طرح انبیاء کی تبلیغ دنیا میں پہنچتی ہے اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آواز بھی پہنچی۔ اور بعض کے نزدیک یہ خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے جس کا حکم آپ کو حجۃ الوداع میں دیا گیا۔ لیکن یہ سورت مکی ہے اور حجۃ الوداع میں اس آیت کا نزول صحیح نہیں بلکہ خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور اس میں حج کی فرضیت کا ذکر ہے۔

2218- بَآئِسَ وہ ہے جسے بُؤس پہنچا ہو [دیکھو نمبر: 215]۔ اور بؤس اس شدت کو کہتے ہیں جو فقر کی وجہ سے ہو۔ (غ)

حج کے منافع:

مَنَافِعَ سے مراد دنیوی اور اخروی دونوں قسم کے فوائد لیے گئے ہیں۔ مگر اصل غرض منافع اخروی ہے۔ اور منافع کی تنکیر ان کی عظمت اور کثرت کے لیے ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا سب سے بڑا نفع ہے۔ مگر لفظ کا جمع لانا خود بتاتا ہے کہ اس میں مختلف قسم کے فوائد شامل ہیں۔ اور حج میں روحانی فوائد بہت کثرت سے ہیں۔ انہی میں سے ایک مساوات کا وہ منظر ہے جو سوائے حج کے اور دنیا میں کہیں نظر نہیں آتا۔ ایسا ہی سب مسلمانوں کا مل کر دعا کرنا وغیرہ، اللہ تعالیٰ کی عظمت و جبروت کا دل پر اثر، مسلمانانِ عالم میں اتحاد، اسلام اور مسلمانوں کی بہتری کی تجاویز کو عمل میں لانا وغیرہ۔

اعمال حج کی اصل غرض:

﴿اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ﴾ سے مراد عموماً ایام نحر لیے گئے ہیں یعنی عید کا دن اور دو دن اس کے بعد۔ کیونکہ یہاں قربانیوں کا خاص طور پر ذکر ہے۔ اور فی الحقیقت ایام حج بھی اس میں شامل ہیں۔ اس لیے کہ قربانی حج کی آخری منزل ہے اور امام ابوحنیفہ نے ذوالحج کے دس دن ہی مراد لیے ہیں۔ پس مراد صرف جانوروں کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینا نہیں بلکہ عبادت مراد ہے، یہاں تک کہ قربانی کا دن آجائے۔ اور ان الفاظ میں یہ ذکر اس لیے کیا کہ تا قربانی کی اصل غرض کی طرف توجہ دلائی جائے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ اعمال حج کل کے کل صرف اللہ کے ذکر کے لیے ہیں۔ اور اس بات کو کہ قربانی کی غرض ذکر اللہ کس طرح پر ہے اور کھول کر [آیت:34] میں بیان کیا ہے اور آخرت پر ہدایت فرمائی کہ قربانیوں کے گوشت سے خود بھی کھاؤ، جس میں دوستوں عزیزوں کو کھلانا بھی آجاتا ہے اور محتاجوں کو بھی کھلاؤ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانیوں کا

ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَ لْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَ لْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۲۹﴾

پھر چاہئے کہ اپنی میل کچیل اتاریں اور اپنی منتوں کو پورا کریں اور قدیم گھر کا طواف کریں۔ (2219)

گوشت ضائع نہیں ہونا چاہئے۔ اور اس میں سے ایک حصہ محتاجوں کو بھی کھلانا چاہئے۔

2219- تَفَثَ اصل میں ناخن کی میل کو کہا جاتا ہے اور ایسی چیز کو جسے بدن سے دور کرنا چاہئے اور قضاء کے معنی چونکہ قطع کرنا آتے ہیں اس لیے یہاں مراد اس کا ازالہ ہے۔ (غ)

عَتِیْقِ متقدم کو کہتے ہیں۔ یعنی جو دوسروں سے آگے بڑھا ہوا ہو۔ خواہ زمانہ کے لحاظ سے ہو یا مکان کے یا رتبہ کے۔ اس لیے قدیم کو بھی عتیق کہا جاتا ہے اور کریم کو بھی، اور جو غلامی سے آزاد ہوا سے بھی۔ اور خانہ کعبہ کو عتیق اس لیے کہا کہ وہ اس سے ہمیشہ آزاد رہا کہ جبابرہ اس کو ذلت پہنچا سکیں۔ (غ) اور عِتق خلاف رِقّ ہے اس کے معنی حریت ہیں۔ اور عتیق سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: [أَنْتَ عَتِيقُ اللهِ مِنَ النَّارِ] (جامع الترمذی، کتاب المناقب، باب 44، حدیث: 4043) یعنی آگ سے آزاد کیا گیا۔ اور حدیث ابن زبیر رضی اللہ عنہما میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا نام اس لیے بیت عتیق رکھا ہے کہ اسے ظالم حملہ آوروں سے آزاد کیا اور کبھی کوئی ظالم حملہ آور اس پر غالب نہیں آیا۔ اور ﴿الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ﴾ اس کے قدیم ہونے کے لحاظ سے بھی اس کا نام ہے۔ کیونکہ وہ ﴿اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ﴾ ہے۔ (ل) پس عتیق کے معنی قدیم بھی ہیں اور آزاد یا اعلیٰ درجہ کا بھی۔ اور روح المعانی میں تُبّع نے اس کا قصد کیا تو اسے فالج ہو گیا اور ابرہہ نے قصد کیا تو اس کا قصہ اصحاب فیل کے واقعہ کے نام سے مشہور ہے۔ اور حجاج کا منشا کعبہ کی اہانت نہ تھا بلکہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما کا اخراج اور قرامطہ کا حجر اسود لے جانا شاید اسی قبیل سے تھا۔

ظاہری صفائی کی تاکید:

یہاں مطلب تو صرف اس قدر تھا کہ قربانی سے فارغ ہو کر بال وغیرہ کٹوالیں یا حالت احرام سے نکل جائیں۔ مگر اس کو ادا ان الفاظ میں کیا ہے کہ اپنی میل کچیل دور کریں۔ اور میل کے لیے بھی ناخن کی میل کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ ایام حج میں بعض افعال کا نہ کرنا جیسے بال یا ناخن کتروانا وغیرہ ایک خاص مقصد کے لیے ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ اسے پسند نہیں کرتا کہ ایک مسلمان کا ناخن بھی ایسا ہو کہ اس میں میل ہو۔ اس میں اعلیٰ درجہ کی جسمانی صفائی کی تعلیم دی ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ جسم کی صفائی کے تمام مراتب کو بدرجہ غایت ملحوظ رکھتے تھے۔

طواف افاضہ طواف صدر:

نذروں کے پورا کرنے سے مراد اعمال حج کا پورا کرنا بھی ہو سکتا ہے۔ اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تخصیص قربانیوں سے کی ہے۔ اور ایسے نیک عمل بھی مراد ہو سکتے ہیں جو اپنے اوپر واجب کر لیے ہوں۔ اور یہاں طواف کے خاص حکم سے مراد طواف افاضہ ہے جو قربانی کے دن ہوتا ہے۔ اور بعض نے طواف الصدر بھی مراد لیا ہے یعنی روانگی کے وقت کا طواف۔

ذٰلِكَ ۚ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ وَ اُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَ اجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۙ﴿۳۰﴾

یہ (یوں ہو) اور جو شخص اللہ کی حرمتوں کی تعظیم کرتا ہے تو وہ اس کے رب کے نزدیک اس کے لیے بہتر ہے اور تمہارے لیے چار پائے حلال ہیں سوائے اس کے جو تم پر پڑھا جاتا ہے۔ پس بتوں کی ناپاکی سے بچو اور جھوٹ بات سے بچو۔ (2220)

حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ؕ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ﴿۳۱﴾

ایک اللہ کے ہو کر اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتے ہوئے اور جو کوئی اللہ کے ساتھ (اور کو) شریک بنائے تو گویا وہ بلندی سے گر پڑا، پھر اسے پرندے اچک لے جائیں گے یا ہوا اسے اُڑا کر دور کے مکان میں پھینک دے گی۔ (2221)

2220- ﴿ذٰلِكَ﴾ یہ اور ایسے ہی دوسرے اسمائے اشارہ دو کلاموں کے درمیان فصل کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ اور مراد ہے [اَلْاَمْرُ كَذٰلِكَ]۔ (ر)

﴿حُرُمٰتِ﴾۔ حُرمة کی جمع ہے۔ وہ چیزیں جن کا احترام واجب ہے اور وہ تمام مناسک حج ہیں۔ اور ابن زید کہتے ہیں پانچ چیزیں ہیں۔ ① مشعر حرام، ② مسجد حرام، ③ بیت حرام، ④ شہر حرام اور ⑤ محرم۔

﴿الْاَوْثَانِ﴾۔ وَثن جو اپنی جگہ ٹھہرا ہوا ہو اور حرکت نہ کرے۔ اور [وَثَنْ، صَنَمْ] یعنی بت کو کہتے ہیں یا چھوٹے بت کو اور ابن اثیر نے وَثَن اور صَنَم میں فرق کیا ہے کہ وَثَن وہ ہے جس کے لیے جثہ ہو خواہ وہ زمین کے جواہر سے بنایا گیا ہو یا لکڑی اور پتھر سے۔ مثلاً آدمی کی صورت پر جو بنایا جائے اور قائم کیا جائے اور اس کی عبادت کی جائے اور صَنَم صورت بلا جثہ ہے۔ اور بعض نے دونوں میں کچھ فرق نہیں کیا۔ (ل)

جب ظاہری میل کچیل کا ذکر کیا تو دو اندرونی ناپاکیوں کا بھی ذکر کیا۔ یعنی ایک بتوں کی ناپاکی اور دوسرے جھوٹ کی ناپاکی۔ اس لیے کہ خانہ کعبہ توحید کا نشان ہے۔ اور صدق توحید کی طرح تمام نیکیوں کی جڑ ہے۔ گویا بتایا کہ حج کرتے ہو تو ہر قسم کی اندرونی ناپاکیوں سے بھی بچو۔ اور انعام کا ذکر چونکہ حج میں آنا تھا اس لیے ان کا بھی یہاں ذکر کیا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ چار پایوں کے ساتھ بہت سی مشرکانہ رسوم کو وابستہ کیا گیا تھا۔

2221- ﴿سَحِيْقٍ﴾۔ سَحق۔ کسی چیز کا باریک پیسنا ہے اور سُحْقًا کے معنی بُعد یعنی دوری ہیں ﴿فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ﴾ [الملك:

ذٰلِكَ ۚ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴿۳۲﴾

یہ (اسی طرح ہے) اور جو کوئی اللہ کے نشانوں کی تعظیم کرتا ہے تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔ (2222)

لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَاۤ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۳۳﴾ ع 4 8 11

تمہارے لیے ان میں ایک مقرر وقت تک فائدے ہیں، پھر ان کی آخری منزل قدیم گھر کی طرف ہے۔ (2223)

11:67] ''پس دوزخ والوں کے لیے دوری ہے۔'' اور سَحِيْقٍ کے معنی بعید ہیں۔ (ل)

شرک میں ذلت:

اس میں شرک کا انجام بتایا، گویا توحید سے انسان کا مقام بلند ہوتا ہے اور شرک کر کے وہ اپنے آپ کو نیچے گراتا ہے اور مشرک فی الواقع اپنے آپ کو اس قدر ذلیل کرتا ہے کہ اس سے بڑھ کر انسان کی ذلت نہیں ہوسکتی۔ اور ﴿خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ﴾ اس لیے فرمایا کہ فطرتاً تو انسان کو بلند مقام پر کھڑا کیا گیا ہے۔ پس شرک کو اختیار کرنا اس مقام بلند سے گرنا ہے۔ اور پرندوں کے اچک لے جانے کی تشبیہ خواہشات سفلی کے انکار کو پریشان کرنے سے ہے۔ کیونکہ ایسے شخص کو اطمینان قلب حاصل نہیں ہوتا۔ اور ہوا کے دور پھینک دینے سے مراد ضلالت میں اس قدر دور نکل جانا ہے کہ جس کا نتیجہ سوائے ہلاکت کے کچھ نہیں۔

2222- **افعال حج کا مقصد:** گو ہر عبادت کے ظاہری ارکان ہیں جیسے حج کے۔ مگر ان تمام افعال کا مقصد بھی دل کی حالت کا بدلنا ہے اور دل میں تقویٰ پیدا کرنا۔ اس لیے فرمایا کہ ﴿شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ﴾ کی تعظیم سے دلوں میں اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام کی عزت پیدا کرو۔ ﴿شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ﴾ کے لیے [دیکھو نمبر: 781]۔ اس سے مراد تمام وہ امور ہیں جن میں انسان شرعاً مکلف کیا گیا ہے، یعنی سب حدود و فرائض۔ اور خصوصیت سے مراد اعمال حج بھی ہو سکتے ہیں اور قربانیاں بھی۔

2223- مَحِلّ مصدر میمی ہے اور [مَحِلُّ الدَّيْنِ] کے معنی ہیں قرضہ کی اجل یعنی اس کا مقرر وقت۔ (ل) اور یا وقت نحر مراد ہے۔ (ر) اور فِيْهَا میں قربانیوں کی طرف ہی اشارہ ہے۔ جیسے اگلے رکوع کے مضمون سے ظاہر ہے۔ اور بعض نے کل اعمال حج مراد لے کر مَحِلُّهَا کے معنی لوگوں کا حالت احرام سے نکلنا لیا ہے۔ اور کل حدود و فرائض کو مراد لے کر یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ تمام احکام دینی کی آخری منزل حج ہے۔ کیونکہ حج میں اللہ تعالیٰ سے عاشقانہ تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔ اور دیگر عبادات میں محض عبودیت کا رنگ ہے اور بیت عتیق کا لفظ شاید اسی طرف اشارہ کرنے کے لیے اختیار کیا کہ تمام تعلقات سے آزاد ہو کر انسان صرف اللہ تعالیٰ کا ہو جائے۔ اور چونکہ حج ہی اس رکوع کا مضمون ہے اور ﴿شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ﴾ کے لفظ کو قربانیوں پر محدود کرنے کی کوئی وجہ نہیں، اس لیے یہ آخری معنی ہی اصل منشائے قرآنی معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر کیا بھی جائے تو بھی قربانیوں کے کرنے میں انسان کے اپنے حصہ حیوانیت کو قربان کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ دیکھو اگلا نوٹ۔

وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ؕ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗۤ اَسْلِمُوْا ؕ وَ بَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ۙ﴿۳۴﴾

اور ہر قوم کے لیے ہم نے قربانی مقرر کی ہے تا کہ اللہ کا نام اس پر یاد کریں جو اس نے انہیں چار پائے جانوروں سے دیئے ہیں۔ پس تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ سو اسی کے فرمانبردار ہو جاؤ اور عاجزی اختیار کرنے والوں کو خوش خبری دے۔ (2224)

2224- مَنْسَك۔ [دیکھو نمبر: 163]۔ اصل اس کی یہی ہے کہ کل عبادات اور طاعات پر بولا جاتا ہے۔ اور لکھا ہے کہ یہاں اس کے معنی نحر یعنی قربانی ہیں۔ مگر [آیت نمبر: 67] میں جہاں یہی الفاظ ہیں ﴿لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ﴾ سب عبادات اور طاعات ہی مراد ہیں۔ اور یہاں بھی لفظ عام ہی ہے۔ اور لِيَذْكُرُوا میں نتیجہ ان عبادات کا بتایا ہے۔

قربانی کا اصل مقصود:

اس رکوع میں قربانی کا مضمون بیان کیا ہے اور اس کی ابتدا یوں کی ہے کہ ہر قوم کے لیے ہم نے عبادات مقرر کیں اور ان عبادات کی اصل غرض یہ ہے کہ وہ اللہ کا نام چار پایوں پر یاد کریں، بالفاظ دیگر قربانی کریں۔ ایک جانور کی قربانی عبادت کی غرض کیونکر ہو سکتی ہے۔ وہ خود اگلے الفاظ میں بتا دیا کہ ایک خدا کی ہی فرمانبرداری کرو۔ گویا اصل غرض یہ ہے کہ کل خواہشات حیوانی و سفلی کو اس معبود حقیقی کی فرمانبرداری کے سامنے قربان کر دیا جائے۔ پس قربانی فی الحقیقت انہی خواہشاتِ حیوانی کو قربان کرنے کا نام ہے اور اسی معنی میں یہ عبادت کی غرض ہے۔ اور ﴿بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ﴾ کی قربانی بھی اسی حقیقی قربانی کا ظاہری نشان ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان دو مختلف قسم کی خواہشات سے بنا ہوا ہے۔ ایک اس کی حیوانی خواہشات ہیں جو اس سفلی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں اور ایک ملکی خواہشات ہیں جو ان خواہشاتِ حیوانی سے الگ اور ان سے بالاتر ہیں۔ مثلاً اپنا آرام چاہنا۔ یہ ایک ایسی خواہش ہے جو حیوانی زندگی سے تعلق رکھتی ہے۔ انسان کا جسم آرام کا محتاج ہے اور اپنی حقیقی ترقی یا دوسروں کی بھلائی کے لیے اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنا یہ ایک ملکی خواہش ہے۔ ایسا ہی ہر چیز کو اپنے قبضہ میں لانا یہ ایک حیوانی خواہش ہے، اور دوسروں کے حقوق کی عزت کرنا یہ ایک ملکی خواہش ہے۔ انسان کو جس قدر عبادات سکھائی گئی ہیں ان کی اصل غرض یہی ہے کہ حیوانی خواہشات کو ملکی خواہشات کے ماتحت کر دیا جائے۔ بالفاظ دیگر ان کے سامنے قربان کر دیا جائے۔ یعنی انسان میں جو حصہ حیوانیت کا ہے اسے ملکی حصہ کے سامنے قربان کر دیا جائے۔ اور اس کے لیے یہ ظاہری نشان ہے۔ اسی اصول کو قرآن کریم نے یہاں کھول کر بیان کیا ہے۔ اور جس طرح حیوانات میں ایک اجل مسمی تک فوائد ہیں، اسی طرح انسان کی حیوانی زندگی میں بھی ایک اجل مسمیٰ تک فوائد ہیں۔ جس کی طرف پچھلی آیت میں اشارہ بھی ہے۔ اگلی آیات میں اور خود یہاں لفظ مُخْبِت میں اسی مضمون کی مزید تشریح ہے۔

الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ الصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ وَ الْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ ۙ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۵﴾

وہ کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل خوف محسوس کرتے ہیں اور اس پر صبر کرنے والے جو انہیں (تکلیف) پہنچتی ہے اور نماز کے قائم کرنے والے اور وہ اس سے جو ہم نے انہیں دیا ہے خرچ کرتے ہیں۔ (2225)

وَ الْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۪ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَ الْمُعْتَرَّ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۳۶﴾

اور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمہارے لیے اللہ کے نشانوں سے ٹھہرایا ہے، تمہارے لیے ان میں بھلائی ہے تو اللہ کا نام ان پر یاد کرو جب (وہ) قطار باندھے ہوئے (ہوں) پھر جب وہ پہلو کے بل پر گر پڑیں، تو ان سے کھاؤ اور سوال کرنے والے اور سوال نہ کرنے والے کو کھلاؤ۔ اسی طرح ہم نے انہیں تمہارے کام میں لگا دیا ہے تاکہ تم شکر کرو۔ (2226)

2225- اس آیت میں پہلی آیت کے مضمون کی ہی مزید وضاحت ہے۔ دل میں خوف الٰہی کا ہونا، مصائب پر صبر کرنا، نماز کے ذریعے اپنے نفس کی اصلاح کرنا، اپنے مال اور اپنے قویٰ کو جو اللہ تعالیٰ نے دیئے ہیں مخلوق خدا کی بھلائی میں لگا دینا۔ یہی چیزیں ہیں جو انسان میں قربانی کی وہ روح پیدا کرتی ہیں جس سے اس کی خواہشات سفلی بکلی حالت اعتدال پر آ جاتی ہیں۔

2226- بُدْنَ۔ بَدَن جسم کو کہتے ہیں اور یہ نام جثہ کی بڑائی کے لحاظ سے ہے۔ جس طرح جَسَد اس کے رنگ کے لحاظ سے ہے۔ ﴿فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ﴾ [یونس: 92:10] ''سو آج ہم تیرے بدن کو بچا دیں گے۔'' اور بَدَن کے معنی موٹا ہو گیا اور بَدَنَةٌ (جس کی جمع بُدْن ہے) قربانی کو اس کی موٹائی کے لحاظ سے کہا جاتا ہے۔ (غ) اور اونٹ اور گائے کی قربانی پر ہی یہ لفظ بولا جاتا ہے یا صرف اونٹ پر۔ (ر)

﴿صَوَآفَّ﴾۔ صَآفَّةٌ کی جمع ہے یعنی صف میں کھڑے ہوئے۔ اور بعض نے اس کے معنی صَافِنٌ کیے ہیں، یعنی ایسی حالت میں کھڑے ہوئے کہ ان کی ٹانگ بندھی ہوئی ہو۔

﴿وَجَبَتْ﴾۔ وُجُوْبٌ کے معنی ثبوت یا ٹھہر جانا ہیں۔ اور [وَجَبَتِ الشَّمْسُ] کے معنی ہیں غَرَبَتْ یعنی سورج غروب

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَ لٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۷﴾

نہ ان کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں اور نہ ان کے خون، لیکن اسے تمہاری طرف سے تقویٰ پہنچتا ہے۔ اسی طرح اس نے انہیں تمہارے کام میں لگا دیا تا کہ تم اس پر اللہ کی بڑائی کرو جو اس نے تمہیں ہدایت دی اور احسان کرنے والوں کو خوش خبری دو۔ (2227)

ہو گیا۔ اسی معنی میں یہاں ہے یعنی گر جانے سے اس کا پہلو زمین سے لگ جائے۔

قَانِعَ۔ قَنَاعَة تھوڑی ان چیزوں پر راضی ہو جانا جن کا انسان محتاج ہو اور یہ قَنِع یَقنَعُ سے ہے۔ اور قَنَع (مصدر قُنُوْعٌ) کے معنی ہیں سوال کیا۔ اور بعض کے نزدیک قَانِعَ وہ سوالی ہے جو الحاح نہیں کرتا اور جو مل جائے اس پر راضی ہو جاتا ہے۔ اور بعض کے نزدیک قَانِعٌ، قِنَاعٌ سے ہے جس کے ساتھ سر ڈھانکا جاتا ہے۔ گویا وہ ایسا محتاج ہے جو اپنی محتاجی کے اخفا کے لیے سر ڈھانک لیتا ہے۔ (غ)

مُعْتَرَّ وہ ہے جو سوال کے لیے آگے ہونے والا ہو۔ اور عَرّ اور عُرّ خارش کو کہتے ہیں جو بدن میں عارض ہو جاتی ہے اور اسی سے تشبیہ کے لحاظ سے مَعَرَّة نصرت کو کہا جاتا ہے ﴿فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ [الفتح: 25:48] ''پھر تمہیں ان کی وجہ سے لاعلمی میں کوئی نقصان پہنچ جائے۔'' بعض کے نزدیک قَانِعَ اور مُعْتَرَّ میں فرق یہ ہے کہ قانع سوال کرنے والا ہے اور معتر وہ جو تمہارے پاس اپنی حاجت کے لیے آتا ہے خواہ سوال کرے یا نہ کرے۔ (ل) اور بعض کے نزدیک قانع وہ ہے جو اس پر راضی ہو جو اس کے پاس ہے اور معتر وہ جو سوال کے لیے آگے آتا ہے۔ (ر) اور ابن جبیر کا قول ہے کہ قانع اہل مکہ ہیں اور معتر سب لوگ۔ (ر)

اس آیت میں اونٹوں کی قربانیوں کو ﴿شَعَآئِرِ اللّٰهِ﴾ کہہ کر صاف بتا دیا کہ وہ بطور نشان کے ہیں اور اصل مقصد ان کی قربانی میں کچھ اور ہے جو اگلی آیت میں اور بھی صراحت سے مذکور ہے۔ اور اونٹ کو ذبح کرنے کا طریق بھی اس میں بتا دیا۔

2227- يَّنَالَ۔ يَنل وہ چیز ہے جو انسان اپنے ہاتھ سے لیتا ہے۔ ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ﴾ [آل عمران: 92:3] ''تم راستبازی کو ہرگز حاصل نہیں کرو گے۔'' ﴿وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا﴾ [التوبة: 120:9] ''اور نہ دشمن سے کچھ چیز حاصل کرتے ہیں۔'' (غ) اور اللہ کا ہاتھ اس کی قدرت اور طاقت ہے۔

غرض قربانی تقویٰ کا پیدا کرنا ہے:

یہاں صفائی سے بیان کر دیا کہ قربانی کی غرض اس کا گوشت نہیں جو کھایا جاتا ہے، نہ اس کا خون ہے جو گرایا جاتا ہے۔ نہ تو خون

اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ﴿۳۸﴾ ع 5/5 12

اللہ مومنوں سے (دشمنوں کو) ہٹاتا رہتا ہے۔ اللہ کسی دغاباز، ناشکر گزار کو پسند نہیں کرتا۔(2228)

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۨ ﴿۳۹﴾

ان لوگوں کو اجازت دی گئی جن سے لڑائی کی جاتی ہے، اس لیے کہ ان پر ظلم کیا گیا اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔(2229)

الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ

وہ جو اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے، صرف اس بات پر کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں کو

کے گرانے کا نام قربانی ہے اور نہ گوشت غربا کو کھلانے کا نام۔ بلکہ قربانی حقیقت میں وہ تقویٰ ہے جو انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ اور لُحُوم اور دِماء کا ذکر اس لیے کیا کہ خون چھڑکنے اور گوشت پھیلانے کی رسم اہل جاہلیت میں بھی پائی جاتی تھی، اور اَور اقوام میں بھی پائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا تعلق قلوب سے ہے نہ اجسام سے۔

2228- **قربانی اور جنگ:** ﴿يُدٰفِعُ﴾۔ [دیکھو نمبر: 322] اس آیت میں صاف جنگ کا مضمون شروع کر دیا ہے جو اگلے رکوع کا مضمون ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اصل مضمون کی طرف رجوع کیا ہے۔ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ جس کے آخر پر ہے ﴿وَ مَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾[25] گویا وہ عذاب الیم آنحضرت ﷺ کے دشمنوں پر جنگوں کے رنگ میں آنے والا تھا، اور قربانی اور جنگ میں یوں تعلق بھی بتا دیا۔ گویا اگر تم میں قربانی کی روح پیدا ہوگئی ہو تو پھر تم اس قابل بھی ہو کہ حق کی خاطر جنگ کرو۔ اور یہاں گو اللہ تعالیٰ نے مدافعت کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ مگر مطلب یہ نہیں کہ تم خاموش ہو کر بیٹھے رہے، بلکہ بتایا یہ ہے کہ اب تمہیں جنگ کے لیے تیار ہو جانا چاہئے۔ اللہ کس طرح دشمن کو دور کرتا ہے، یہ بھی خود ہی آگے بتا دیا۔ ﴿وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ﴾[40]

2229- سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ یہ پہلی آیت ہے جو قتال کے بارہ میں نازل ہوئی۔ (ث) بعض روایات میں ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کو کفار نے مکہ سے نکال دیا تو آپ نے فرمایا اب یہ ہلاک ہو جائیں گے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ضرور لڑائی ہوگی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ہجرت کے بعد یہ آیت نازل ہوئی یا ہجرت میں یا اس سے کچھ پہلے۔ کیونکہ گو نبی کریم ﷺ دیر سے نکلے مگر صحابہ سب پہلے ہجرت کر چکے تھے۔ اور یہ جو فرمایا کہ ﴿وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ﴾ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ سوائے جنگ کے دوسری طرح پر بھی مدد کر سکتا تھا۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ باوجود اس قدر قلیل تعداد میں ہونے کے انہیں جنگ کی اجازت دی جاتی ہے تو یہ ہلاک نہیں ہوں گے، اس لیے کہ ان کا مددگار اللہ ہے۔

اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝۴۰

ایک دوسرے کے ذریعہ سے نہ ہٹاتا تو یقیناً راہبوں کی کوٹھڑیاں اور گرجے اور عبادتگاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام بہت لیا جاتا ہے گرادی جاتیں۔ اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس (کے دین) کی مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ طاقتور غالب ہے۔ (2230)

2230- هُدِّمَتْ۔ هَدم عمارت کا گرانا ہے اور تَهدِیم میں کثرت پائی جاتی ہے۔ (غ)

﴿صَوَامِعُ﴾۔ صَومَعَةٌ کی جمع ہے۔ اور وہ ایسی کوٹھڑی ہے جو اوپر سے تنگ ہو۔ کیونکہ اَصمع اس شخص کو کہتے ہیں جس کے کان چھوٹے ہونے کی وجہ سے سر سے ملے ہوئے ہوں۔ (غ) اور صَومَعَةٌ راہب کی کوٹھڑی کو کہتے ہیں۔ (ل)

﴿بِيَعٌ﴾۔ بِيعَه کی جمع ہے۔ جو نصاریٰ کی عبادت گاہ پر بولا جاتا ہے۔ اور بعض نے اسے یہود کی عبادت گاہ کہا ہے۔ (ل)

﴿صَلَوٰتٌ﴾۔ صلوٰة کی جمع ہے۔ مسجد پر بھی بولا گیا ہے اور یہود کی عبادت گاہ کو بھی کہتے ہیں۔ [دیکھو نمبر: 663] اور اس کے اصل معنی عام عبادت گاہ ہی ہیں، خواہ کسی مذہب کی ہو۔ کیونکہ جب نصاریٰ کے راہبوں کی کوٹھڑیوں تک کا اور ان کے گرجاؤں کا ذکر کر دیا اور یہی آنحضرت ﷺ سے پہلے آخری مذہب تھا۔ تو اب علیحدہ علیحدہ مذاہب کا نام لینے کی بجائے ایسا لفظ بول دیا جو ہر عبادت گاہ پر صادق آتا ہو۔

اسلامی جنگوں کی غرض:

یہاں نہایت صفائی سے اسلامی جنگ کی غرض صرف مساجد کو بچانا نہیں بلکہ ہر قوم کی عبادت گاہوں کو بچانا بتائی ہے۔ یہاں تک کہ عبادت گاہوں کو چھوڑ کر عبادت کرنے والوں کی کوٹھڑیوں کو بھی حفاظت میں شامل کیا اور صحابہ کی جنگوں میں بھی اس بات کو مدنظر رکھا جاتا تھا کہ کسی راہب کی کوٹھڑی کو اور کسی عبادت گاہ کو نقصان نہ پہنچے۔ بلکہ بعض معاہدات کی رو سے گرجا گھروں کی حفاظت اور مرمت کا انتظام بھی بیت المال کے ذمے تھا۔ پس اسلام کی جنگ مذہبی آزادی کے لیے تھی، نہ صرف مسلمانوں کی آزادی کے لیے۔ یہ اسلام کا کمال ہے کہ نہ صرف سب مذاہب کی اصلیت کو خدا کی طرف سے ماننا اور تمام انبیاء پر ایمان لانا اصول ایمان میں داخل کر دیا، بلکہ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کی حفاظت کو مسلمانوں کے فرائض میں داخل کر دیا۔ اور پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ کس قدر پُرزور الفاظ میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ چند متفرق مسلمان جو نزول آیت کے وقت اپنی جانیں بچانے کے لیے بھاگ گئے تھے اور جن کی جمعیت کا کہیں نام ونشان نہ تھا ان کی تائید میں خدا کا ہاتھ ہوگا اور وہ غالب آئیں گے اور اس قابل ہوں گے۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾

وہ جنہیں اگر ہم زمین میں طاقت دیں تو وہ نماز کو قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور اچھی باتوں کا حکم کریں گے اور بری باتوں سے روکیں گے اور سب کاموں کا انجام اللہ کے اختیار میں ہی ہے۔[2231]

وَ اِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ عَادٌ وَّ ثَمُوْدُ ﴿۴۲﴾

اگر تجھے جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے نوح کی قوم اور عاد اور ثمود نے جھٹلایا۔

وَ قَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَ قَوْمُ لُوْطٍ ﴿۴۳﴾

اور ابراہیم کی قوم اور لوط کی قوم نے۔

وَّ اَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَ كُذِّبَ مُوْسٰى فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۴﴾

اور مدین کے رہنے والوں نے اور موسیٰ (بھی) جھٹلایا گیا، سو میں نے کافروں کو مہلت دی پھر انہیں پکڑا۔ پس میرا انکار (ان پر) کیسا ہوا؟[2232]

2231- مکہ کے آخری ایام کی یہ سورت ہے۔ مسلمان کچھ حبش میں ہیں، کچھ مدینہ میں۔ آنحضرت ﷺ کو خود مکہ چھوڑنا پڑا ہے، کافر اپنی کامیابی پر خوش ہیں۔ اور ادھر حکومت اور بادشاہت کی خبر ہی نہیں دی جاتی بلکہ اتنی وسیع حکومت کی خبر دی جاتی ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی مسلمانوں کے ماتحت آ جائیں گے۔ اور پھر ساتھ ہی یہ پیشگوئی بھی کی جاتی ہے کہ حاکم اور بادشاہ ہو کر یہ لوگ کیا نمونہ دکھائیں گے۔ یہی تمام باتیں اپنی کوئی نظیر نہیں رکھتیں۔ جس طرح یہ بات بھی اپنی کوئی نظیر نہیں رکھتی کہ کسی قوم نے سوائے مسلمانوں کے حکومت پا کر نیکی کا دنیا میں پھیلانا اپنی زندگی کی اصل غرض سمجھا ہو یا فی الواقع فتوحات کے نشہ میں اور انتظام ملکی میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی پروا کی ہو۔

2232- نَکِیْر اور انکار کے ایک ہی معنی ہیں یعنی ضد عرفان ہے۔ [دیکھو نمبر: 1481] اور [نَکَرتُ عَلٰی فُلَانٍ] اور اَنکَرتُ کے معنی ہیں اس کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جو اسے روک دے۔ (غ) اور نَکِیْر اس انکار کا نام ہے جس کے معنی تغیر ہیں یعنی خوشی کی حالت سے ایسی حالت کی طرف تبدیل کر دینا جو تمہیں ناپسند ہوں۔ (ل) اور مُنکَر وہ فعل ہے جسے عقل صحیح قبیح ٹھہرائے یا اگر عقل صحیح اس کے قبح یا حُسن کا حکم نہ لگا سکے تو شریعت اس کے قبح کا حکم لگائے اور تنکیر کے معنی ہیں ایسا کر دینا کہ پہچانا نہ جا سکے۔ ﴿نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا﴾ [النمل: 41:27] ''اس کے لیے اس کے تخت کی صورت بدل دو۔'' (غ)

فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَ هِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّ قَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴿۴۵﴾

سو کتنی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا اور وہ ظالم تھیں۔ سو وہ خالی ہیں اپنی چھتوں پر اور کتنے بیکار کنویں اور پکے محل (ویران ہیں۔)(2233)

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَاۤ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ﴿۴۶﴾

تو کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں۔ پس ان کے دل ہوتے جن سے وہ سمجھتے، یا کان ہوتے جن سے وہ سنتے۔ کیونکہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔(2234)

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَ لَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ؕ وَ اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿۴۷﴾

اور تجھ سے عذاب جلد مانگتے ہیں اور اللہ اپنے وعدہ کا خلاف ہرگز نہیں کرے گا اور ایک دن تمہارے رب کے نزدیک ایک ہزار سال کے برابر ہے جو تم گنتے ہو۔(2235)

یہاں جن اقوام کی تکذیب کا ذکر ہے وہ تاریخی ترتیب سے ہے۔ اور بتایا ہے کہ جب انہوں نے حق کو قبول نہ کیا اور دنیوی زندگی پر ہی گر گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس آرام کی حالت کو دکھ کی حالت میں تبدیل کر دیا۔

2233- ﴿بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ﴾ بِئر کے معنی کنواں ہیں۔ اور مُّعَطَّلَةٍ عَطل سے ہے۔ جس کے معنی زینت اور شغل کا جاتے رہنا اور تعطیل زینت اور عمل سے فارغ کر دینا ہیں۔ (غ) بِئْر اور قَصْر، قَرْيَة پر عطف ہیں۔

2234- یعنی زمین میں چلنے پھرنے کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ غور کرتے کہ کس طرح پہلی قومیں ہلاک ہوئیں۔ اور آخر بتا دیا کہ آنکھوں سے تو انسان بہتیرا کچھ دیکھتا ہے مگر غور نہ کرنے سے ہی نقصان اٹھاتا ہے۔ یعنی جب اس کی ہلاکت آتی ہے تو اس کی وجہ سے آنکھوں کا اندھا ہونا نہیں ہوتی بلکہ دل کا اندھا ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ﴾ اور ﴿مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى﴾ وغیرہ میں آنکھوں کا اندھا پن مراد نہیں بلکہ دل کا اندھا پن مراد ہے۔

2235- اللہ کے نزدیک ایک دن کے ہزار سال کے برابر ہونے کا ذکر صرف اس لیے نہیں کیا کہ جسے تم بہت وقت سمجھتے ہو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تھوڑا سا ہوتا ہے۔ بلکہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بعض قوموں کو ایک ایک ہزار سال تک کی مہلت بھی دے دیتا ہے۔ اور دوسری جگہ صاف طور پر اسلام کی ترقی کے لیے ایک ہزار سال تک رکا رہنے کا ذکر ہے۔ ﴿ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَ هِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿۴۸﴾ ع 6 10 13

اور کتنی بستیاں ہیں جنہیں میں نے مہلت دی اور وہ ظالم تھیں۔ پھر میں نے انہیں پکڑا اور میری طرف ہی انجام کار آنا ہے۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَاۤ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۹﴾ ۚ

کہہ، اے لوگو! میں صرف تمہارے لیے کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں۔

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۵۰﴾

پس جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور اچھے عمل کرتے ہیں ان کے لیے بخشش اور عزت کی روزی ہے۔

وَ الَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْۤ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۵۱﴾

اور جو ہماری آیتوں کو ہرانے کی کوشش کرتے ہیں، وہی دوزخ والے ہیں۔ (2236)

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِيٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْۤ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۲﴾ ۙ

اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا اور نہ نبی مگر جب اس نے آرزو کی شیطان نے اس کی آرزو کے بارے میں وسوسہ اندازی کی۔ پس اللہ اسے مٹا دیتا ہے جو شیطان وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ پھر اللہ اپنی آیتوں کو مضبوط کرتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔ (2237)

اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿۵﴾ [السجدۃ: 5:32] ''پھر وہ اس کی طرف چڑھ جائے گا ایک دن میں جس کا اندازہ ایک ہزار سال ہے اس سے جو تم گنتے ہو۔''

2236- ﴿مُعٰجِزِيْنَ﴾۔ عَجْز کے لیے [دیکھو نمبر: 1018] اور اَعْجَزْتُ عَجَّزْتُ عَاجَزْتُ سب کے ایک ہی معنی ہیں، اسے عاجز کیا۔ مگر ﴿مُعٰجِزِيْنَ﴾ کے معنی یہاں لیے گئے ہیں [ظَانِّيْنَ وَ مُقَدِّرِيْنَ اَنَّهُمْ يُعْجِزُوْنَنَا] یعنی یہ خیال کرتے ہوئے اور سمجھتے ہوئے کہ ہمیں عاجز کر دیں گے۔ (غ)

2237- ﴿تَمَنّٰى﴾۔ تَمَنِّی کے معنی کسی چیز کا نفس میں اندازہ کرنا اور اس کی صورت بنانا ہیں [نمبر: 102]۔ اور یہ کبھی محض تخمینہ اور اندازہ

لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ۙ﴿۵۳﴾

تا کہ وہ اسے جو شیطان وسوسہ اندازی کرتا ہے ان لوگوں کے لیے آزمائش کا موجب بنائے جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جن کے دل سخت ہیں اور بلاشبہ ظالم پرلے درجے کے مخالفت میں ہیں۔

ہوتا ہے اور کبھی اس کی بنا اصلیت پر ہوتی ہے۔(غ)

قصہ غرانیق اور اس کی بے بنیادی:

اس آیت کی تفسیر میں بہت سے مفسرین نے ایک جھوٹا قصہ لکھ دیا ہے جس کی کوئی صحیح سند نہیں۔ ابن کثیر کہتے ہیں [قَدْ ذَكَرَ كَثِيْرٌ مِّنَ الْمُفَسِّرِيْنَ هَاهُنَا قِصَّةِ الْغَرَانِيْقَ، وَمَا كَانَ مِنْ رَجُوعٍ كَثِيْرٍ مِّنَ الْمُهَاجِرَةِ إِلَى أَرْضِ الْحَبَشَةِ، ظَنًّا مِنْهُمْ أَنَّ مُشْرِكِيْ قُرَيْشٍ قَدْ أَسْلَمُوْا. وَلٰكِنَّهَا مِنْ طُرُقٍ كُلَّهَا مُرْسِلَةٌ، وَلَمْ أَرَهَا مُسْنِدَةِ مِنْ وَّجْهِ صَحِيْحٍ.] (ابن کثیر، جلد5، صفحہ 441) یعنی بہت سے مفسرین نے یہاں غرانیق کا قصہ لکھ دیا ہے۔۔۔۔لیکن یہ سب روایات مرسل ہیں اور میں نے کسی وجہِ صحیح سے اس کی سند کو رسول اللہ ﷺ تک نہیں پایا۔ اور غرانیق کا قصہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ سورۂ نجم پڑھتے وقت جب یہاں پہنچے ﴿اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَ الْعُزّٰى ۙ﴿۱۹﴾ وَ مَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ﴿۲۰﴾﴾ [النجم: 53:19-20] ''تو کیا تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا۔ اور منات تیسرے اور کو۔'' تو بجائے ﴿اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَ لَهُ الْاُنْثٰى ﴿۲۱﴾ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴿۲۲﴾﴾ [النجم: 53:21-22] ''کیا تمہارے لیے لڑکے ہیں اور اس کے لیے لڑکیاں۔ یہ تقسیم تو بہت بے انصافی کی ہے۔'' کے جو الفاظ قرآنی ہیں یوں پڑھ دیا [تِلْكَ الْغَرَانِيقَ الْعُلَى وَإِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجَى] (التحریر والتنویر، جلد17، صفحہ 304)، یعنی یہ بلند مرتبہ دیویاں ہیں اور ان کی شفاعت کی امید رکھی جاتی ہے۔ [نَعُوذُ بِاللهِ مِن ذٰلِكَ]۔ اس قصہ پر بحث سورۂ نجم میں ہی ہوگی۔ یہاں اس قدر ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اس قصہ کو سورۂ حج کی اس آیت سے ملانا واقعات تاریخی کی پوری لاعلمی کا ثبوت دینا ہے۔ سورۂ نجم ابتدائی زمانہ کی سورت ہے اور ہجرت حبش کے ابتدائی ایام کی ہے، یعنی پانچویں سال بعثت کی۔ اور سورۂ حج اس قدر پچھلے زمانہ کی ہے کہ بہت سے لوگوں نے اسے مدنی قرار دیا ہے اور اصل یہ ہے کہ یہ مکہ کے آخری ایام کی ہے۔ جس پر کافی اندرونی شہادت موجود ہے۔ اب ان دونوں سورتوں میں آٹھ سال کا فرق بتاتا ہے کہ یا تو وہ [تِلْكَ الْغَرَانِيقَ الْعُلَى] آٹھ سال تک پڑھا جاتا رہا، جس کی غلط روایات خود ہی تردید کرتی ہیں۔ اور پھر کفار کی ایذارسانی اور شعب میں محصور کرنا وغیرہ سب فرضی قصے ہونے چاہئیں اور یا اس آیت کا کوئی تعلق سورۂ نجم کی اس آیت سے نہیں اور یہی لازماً ماننا پڑے گا۔

وَّ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۴﴾

اور تا کہ وہ جنہیں علم دیا گیا ہے جان لیں کہ وہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے۔ پس وہ اس پر ایمان لائیں۔ پس ان کے دل اس کے لیے نرم ہو جائیں اور یقیناً اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے سیدھے رستہ کی طرف ہدایت کرنے والا ہے۔

نبی کی وحی میں شیطان القا نہیں کرتا:

اگر سیاق و سباق پر غور کیا جائے تو خود معلوم ہو جائے گا کہ جو معنی اس آیت کے عام طور پر سمجھے گئے ہیں وہ ہرگز مراد نہیں۔ ان آیات سے پہلے بھی مخالفت حق کرنے والوں اور ان کی سزا کا ذکر ہے ﴿وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَ هِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا﴾ [48]۔ اور پیچھے بھی یہی ذکر ہے ﴿تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ تَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ﴿۵۵﴾﴾ [55]۔ اور اس مسلسل مضمون کے درمیان ایک بالکل غیر متعلق واقعہ کا آ جانا جس کا اس مضمون سے ادنیٰ تعلق بھی نہیں دکھایا جا سکتا، کسی صورت میں تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں ذکر نبی کی مخالفت کا ہے اور یہی ذکر پہلے اور پیچھے ہے۔

خود الفاظ آیت کو لو تو بھی صاف یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ اصل غلطی صرف لفظ تَمَنّٰی کے استعمال سے لگتی ہے۔ جو اس میں شک نہیں کہ اکثر جھوٹی آرزوؤں کے لیے بولا گیا ہے۔ مگر جیسا کہ امام راغب نے صفائی سے لکھا ہے کہ اس کا استعمال ایسی خواہش اور ایسے اندازہ پر بھی ہوتا ہے جس کی بنا اصلیت پر ہو۔ پس نیک آرزو اور نیک خواہش بھی اُمْنِيَّةٌ ہے۔ اور یہاں وہی مراد ہے اور غلط آرزو ہرگز مراد نہیں۔ اور الفاظ ﴿فِيْۤ اُمْنِيَّتِهٖ﴾ خود اس قصہ کی غلطی کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس لیے کہ قصہ تو یہ ہے کہ شیطان نے وحی میں دخل دے کر وحی کو بدل دیا اور الفاظ قرآنی میں یہ نہیں کہ ﴿اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْۤ اُمْنِيَّتِهٖ﴾ بلکہ ﴿فِيْۤ اُمْنِيَّتِهٖ﴾ ہے۔ اور اس کے معنی صرف اسی قدر ہیں کہ نبی کی نیک آرزو کے بارہ میں شیطان لوگوں کے دلوں میں وساوس ڈالتا رہتا ہے۔ نہ یہ کہ وہ نبی کی وحی میں کچھ ڈالتا رہتا ہے۔ پھر الفاظ کے حصر کو دیکھو کوئی نبی اور رسول ایسا نہیں بھیجا کہ اس کے ساتھ یہ معاملہ نہ ہوا ہو۔ تو کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وحی میں بھی شیطان نے القا کر دیا تھا؟ غالباً اس سوال کا جواب رسول کریم ﷺ سے بڑھ کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے محبت رکھنے والے مسلمان کبھی اثبات میں نہ دیں گے۔ پھر سب کو چھوڑو ایک بھی نبی کا ذکر قرآن شریف میں نہیں جس کی وحی میں القائے شیطان کا ذکر آیا ہو۔ حالانکہ دوسرے معاملات میں جہاں ایسا حصر کیا ہے اس کی مثالیں بھی دی ہیں۔ مثلاً جب یہ فرمایا کہ سب نبیوں سے استہزا ہوا، سب نبیوں کی تکذیب ہوئی، تو ایک ایک نبی کا ذکر کر کے اس کی تکذیب کا بھی ذکر کر دیا۔ پھر کیا یہ جائے تعجب نہیں کہ حصر تو یہ کیا جائے کہ کوئی نبی اور رسول ایسا ہوا ہی نہیں جس کی وحی میں شیطان نے القاء نہ کیا ہو اور ایک نبی کی مثال پیش نہ کی جائے کہ اس کی وحی میں شیطان نے یوں القاء کر دیا تھا۔ پھر نتیجہ اس کا یہ بتایا ﴿وَّ لِيَعْلَمَ

وَ لَا یَزَالُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِیَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً

اور جو کافر ہیں وہ اس کے بارے میں شک میں ہی رہیں گے، یہاں تک کہ وہ گھڑی ان پر اچانک آ جائے

الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ﴾۔تو کیا صاحب علم لوگوں کو اس کے حق ہونے کا علم نہ ہوسکتا تھا، جب تک کہ شیطان وحی میں القانہ کرے۔یہ کیسی بدیہی البطلان بات ہے۔

شیطان کا القاء شیاطین کی طرف ہی ہوتا ہے:

اس آیت کے معنی صاف ہیں۔اس سے پہلی آیت میں فرمایا تھا﴿وَ الَّذِیْنَ سَعَوْا فِیْۤ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ﴾ یعنی ہماری آیتوں کے ابطال کی کوشش کرتے ہیں، یہ خیال کرتے ہوئے کہ خدا کو عاجز کردیں گے۔تو اب فرمایا کہ یہ مخالفت کچھ تمہارے ساتھ ہی خاص نہیں بلکہ سب انبیاء ورسل کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔یعنی جب کسی نے خدا کے نام کو دنیا میں پھیلانا چاہا اور نیکی کے پھیلانے کی آرزو کی تو شیطان نے لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی شروع کی کہ اس کی مخالفت کرو۔یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ وحی نبی میں شیطان کا القاء ایک ایسا امر ہے جس کی تردید قرآن شریف کا لفظ لفظ کر رہا ہے۔اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے﴿فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۙ۝ لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ﴾[الجن: 72:27-28] یعنی وحی کے آگے پیچھے اللہ تعالیٰ پہرہ لگا دیتا ہے تاکہ جان لے کہ ان کے رب کا صحیح صحیح پیغام پہنچا دیا گیا ہے۔اور ہمارے مفسرین قصہ گھڑتے ہیں کہ خدائی پہرہ پر شیطان غالب آجاتا ہے۔پھر وہ فرماتا ہے کہ کہ شیطان کا میرے بندوں پر کچھ تسلط نہیں۔اور اس لغو قصہ سے یہ اصول تسلیم کیا جاتا ہے کہ انبیاء پر بھی شیطان کا تسلط ہوجاتا ہے۔یہاں تو ذکر نہیں کہ شیطان کس کی طرف القاء کرتا ہے۔مگر قرآن کریم نے دوسری جگہ خود بتادیا کہ شیطانوں کا القا شیطانوں کی طرف یا ان کے متبعین کی طرف ہی ہوتا ہے۔﴿اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِیٰٓـئِهِمْ لِیُجَادِلُوْكُمْ﴾[الأنعام: 121:6] ''بے شک شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں ڈالتے ہیں کہ وہ تم سے جھگڑتے رہیں۔'' اور درحقیقت اس آیت کی تفسیر اس دوسری آیت سے ہوتی ہے﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا﴾[الأنعام: 112:6] ہر نبی کے لیے ہم نے شیطان انسان اور جنّ دشمن بنائے ہیں جو ایک دوسرے کے دل میں باتیں دھوکا دینے کے لیے ڈالتے رہتے ہیں۔پس یہی مراد یہاں ہے۔نبی کی آرزو کو باطل کرنے کے لیے شیطان اپنے اولیاء کے دلوں میں طرح طرح کی باتیں مخالفت کی ڈالتا رہتا ہے۔مگر اللہ تعالیٰ ان تمام باتوں کو منسوخ کردیتا ہے اور اپنی آیات کو مضبوط کردیتا ہے، یعنی حق کو قائم کردیتا ہے۔ہاں یہ شیطان کی مخالفت کمزور دلوں اور سخت دلوں کے لیے موجب فتنہ ہوجاتی ہے۔کیونکہ مخالفت کی وجہ سے مومنوں کو زور لگانا پڑتا ہے، اور کمزور دل چاہتے ہیں کہ سکھ ہی سکھ ہو۔ایسا ہی سخت دل لوگ بھی چونکہ حق کی آخری کامیابی پر ایمان لا ہی نہیں سکتے اس لیے ان کے لیے بھی یہ مخالفت موجب فتنہ ہوجاتی ہے۔جیسا کہ اگلی آیت میں صاف فرمایا۔اور اہل علم کے لیے یہی مخالفت ازدیاد ایمان کا موجب ہوجاتی ہے جس کا ذکر اگلی آیت میں ہے۔اور اسی کے مطابق دوسری جگہ ہے﴿وَ لَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا

اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ۝٥٥
یا ان پر تباہ کرنے والے دن کا عذاب آ جائے۔(2238)

اَلْمُلْكُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝٥٦
بادشاہت اس دن اللہ کے لیے ہی ہوگی، وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ پس جو لوگ ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں وہ نعمت کے باغوں میں ہوں گے۔

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝٥٧ ع
اور جو کافر ہیں اور ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں، تو ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔

ع 7/9/14

وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝٥٨
اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی پھر قتل ہو گئے یا مر گئے، اللہ انہیں اچھا رزق دے گا۔ اور اللہ یقیناً بہترین رزق دینے والا ہے۔(2239)

مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ﴾ [الأحزاب: 22:33] ''اور جب مومنوں نے جماعتوں کو دیکھا انہوں نے کہا یہ وہ ہے جس کا وعدہ اللہ اور اس کے رسول نے دیا تھا۔''

2238- ﴿عَقِيْمٍ﴾۔ عُقْمٌ وہ یُبس ہے جو اثر قبول نہ کرے۔ چنانچہ [دَاءٌ عِقَامٌ] وہ بیماری ہے جو علاج قبول نہ کرے۔ اور وہ عورت عقیم کہلاتی ہے جو نطفہ کو قبول نہ کرے۔ ﴿عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ﴾ [الذاريات: 29:51] ''بڑھیا بانجھ (ہوں)۔'' اور ﴿الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ﴾ [الذاريات: 41:51] ''تباہ کرنے والی ہوا۔'' دو طرح پر ہو سکتی ہے یعنی فاعل کے معنی ہیں جو بادل کو اور درخت کو باردار نہیں کرتی یا بمعنی مفعول جو خود اچھا اثر قبول نہیں کرتی۔ اور ﴿يَوْمٍ عَقِيْمٍ﴾ وہ دن ہے جس میں خوش کوئی نہ ہو۔ (غ) اور بعض نے ﴿يَوْمٍ عَقِيْمٍ﴾ سے مراد جنگ کا دن لیا ہے۔ اس لیے کہ اس دن ان کی اولاد قتل ہو جائے گی۔ (ر) یہاں السَّاعَةُ اور عذاب کو الگ الگ کر کے صاف بتا دیا کہ دونوں سے مراد اس دنیا کا عذاب ہے۔ السَّاعَةُ سے مراد ان کی ہلاکت کی گھڑی ہے اور عذاب اس سے کمتر۔

2239- اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت شروع ہو چکی تھی اور رزق حسن سے مراد یہاں وہ رزق ہے جو انہیں حیات ابدی کا مستحق ٹھہراتا ہے۔ تسلی دی ہے کہ ہجرت کر کے قتل بھی ہو جائے یا مر بھی جائے تاہم عنداللہ وہ ثواب کا مستحق ہے۔

لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۵۹﴾

وہ ضرور انہیں ایسی جگہ میں داخل کرے گا جسے وہ پسند کریں گے اور اللہ یقیناً جاننے والا بردبار ہے۔

ذٰلِكَ ۚ وَ مَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ﴿۶۰﴾

یہ (اسی طرح ہوگا) اور جو اس کی مثل سزا دے جو اسے ایذا دی گئی اور اس پر زیادتی ہوئی ہو، اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا یقیناً اللہ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے۔ (2240)

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۶۱﴾

یہ اس لیے کہ اللہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور کہ اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا يَدْعُوْنَ

یہ اس لیے کہ اللہ ہی حق ہے اور کہ جو کچھ اس کے سوائے

2240- عَاقَبَ یا عقاب کا اصل مفہوم تو بدی کے پیچھے اس کی سزا کا لانا ہی ہے، مگر یہاں عوقب ابتدائی ایذا رسانی پر بولا گیا ہے۔ اور یہ بتانے کو کہ اس کی تکلیف کسی اس کے قصور کا نتیجہ نہ تھی، ﴿ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ﴾ بڑھا دیا یعنی اس پر زیادتی ہوئی۔ اور ثُمَّ یہاں ترتیب کے لیے نہیں بلکہ ایک اور امر کے اظہار کے لیے ہے۔ [دیکھو نمبر: 44] ﴿وَ مَنْ عَاقَبَ﴾ میں جہاں صاف طور پر کفار کو سزا دینے کا ذکر ہے یہ بتا دیا کہ مسلمانوں کو حکومت اور غلبہ ملے گا اور وہ اپنے دکھ دینے والوں کو سزا دینے پر قادر ہوں گے اور اللہ ان کی تائید کرے گا۔ اور مسلمانوں کے غلبہ اور حکومت کی طرف ہی اگلی آیت میں بھی رات اور دن کے ایک دوسرے میں داخل کرنے میں اشارہ ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ ﴿تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ﴾ [آل عمران: 26:3] ''تو جسے چاہتا ہے ملک دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ملک لے لیتا ہے۔'' کے مقابل پر بھی ﴿تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ﴾ [آل عمران: 27:3] ''تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔'' فرمایا ہے۔ اور آیت کے آخر پر اللہ تعالیٰ کی صفات عفو و غفر لانے سے یہ منشا ہے کہ اگر اتنی سزا بھی نہ دو تو اور بھی بہتر ہے۔ کیونکہ اللہ جو تمہارا رب ہے وہ عفو و غفر کرنے والا ہے۔ اور یہی سچ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہرگز اتنی سزا نہیں دی جتنا دکھ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو دیا گیا تھا۔

مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۶۲﴾

پکارتے ہیں وہ باطل ہے اور کہ اللہ بلند شان والا بڑا ہے۔(2241)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۫ فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿۶۳﴾ ۚ

کیا تو نے غور نہیں کیا کہ اللہ بادل سے پانی اتارتا ہے تو زمین سرسبز ہو جاتی ہے۔ اللہ باریک باتوں کا جاننے والا خبردار ہے۔

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۶۴﴾ ع 8 7 15

اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور بلاشبہ اللہ بے نیاز تعریف کیا گیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ يُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۵﴾

کیا تو نے غور نہیں کیا کہ اللہ نے جو کچھ زمین میں ہے تمہارے کام میں لگا رکھا ہے اور کشتی کو (بھی) جو اس کے حکم سے سمندر میں چلتی ہے اور وہ مینہ کو روکتا ہے کہ سوائے اس کی اجازت کے زمین پر پڑے۔ یقیناً اللہ لوگوں پر مہربان رحم کرنے والا ہے۔(2242)

2241- پس اللہ کا نام لینے والے بھی ضرور دنیا میں کامیاب ہوں گے۔ اس لیے کہ حق قائم رہتا ہے اور باطل نابود ہو جاتا ہے۔

2242- ﴿تَقَعَ﴾۔ وُقُوْعَ کسی چیز کا ٹھہرے رہنا اور اس کا گرنا ہے اور وَاقِعَہ صرف سختی اور ناپسندیدگی کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ اور قرآن شریف میں وَقَعَ کا لفظ اکثر عذاب اور سختیوں کے موقع پر ہی آیا ہے۔ ﴿اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۙ﴿۱﴾ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۘ﴿۲﴾﴾ [الواقعة: 56:1-2] ''جب ہو جانے والی (بات) ہو جائے گی۔ اس کے ہو جانے میں کوئی جھوٹ نہیں۔'' ﴿فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۙ﴿۱۵﴾﴾ [الحاقة: 69:15] ''سو اس دن ہو جانے والی بات ہو جائے گی۔'' اور قول کا وُقُوع یہ ہے کہ جس بات پر وہ شامل ہے وہ حاصل ہو جائے۔ ﴿وَ وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا﴾ [النمل: 27:85] کے معنی ہیں کہ عذاب جس کا انہیں وعدہ دیا گیا تھا وہ واجب ہو گیا۔ ﴿اِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ﴾ [النمل: 27:82] ''جب بات ان پر واضح ہو جائے گی۔'' اور ﴿فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ﴾ [النسآء: 4:100] ''تو اس کا اجر ضرور اللہ کے ذمہ ہو چکا۔'' میں بھی مراد اس کا واجب ہونا ہے۔ اور [وَقَعَ الْمَطَرُ سَقَطَ] کی طرح ہے یعنی بارش پڑی۔ (غ) اور اِمْسَاكٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 295] اور سَمَآءٌ کے

وَ هُوَ الَّذِیْۤ اَحْیَاكُمْ ۫ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ﴿۶۶﴾

اور وہی ہے جس نے تمہیں زندہ کیا پھر تمہیں مارے گا پھر تمہیں زندہ کرے گا۔ یقیناً انسان ناشکر گزار ہے۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا یُنَازِعُنَّكَ فِی الْاَمْرِ وَ ادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ؕ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۶۷﴾

ہر ایک قوم کے لیے ہم نے عبادت کا طریق مقرر کیا جس پر وہ چلیں۔ پس تجھ سے اس امر میں جھگڑا نہ کریں اور تو اپنے رب کی طرف بلا، یقیناً تو سیدھے رستہ پر ہے۔ (2243)

لیے[دیکھو نمبر: 31]۔

السَّمَآءَ کے معنی آسمان، بلندی، بارش، بادل ہیں۔ پس السَّمَآءَ کے گرنے سے مراد آسمان کا گرنا ہوسکتا ہے یا مینہ کا پڑنا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی آسمان کو زمین پر گرنے سے روکا ہوا ہے ﴿رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا﴾ [الرعد: 2:13] ''آسمانوں کو بغیر ایسے ستونوں کے بلند کیا جنہیں تم دیکھتے ہو۔'' اور ﴿اِنَّ اللّٰهَ یُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا﴾ [فاطر: 41:35] ''اللہ ہی آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ اپنے رستہ سے ہٹ نہ جائیں۔'' مگر یہاں منشا یہ معلوم نہیں ہوتا اور اس پر ﴿اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ بڑا بھاری قرینہ ہے۔ جو بتاتا ہے کہ جب اللہ کا اذن ہوتا ہے تو وہ سماء گرتا بھی رہتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ آسمان کبھی زمین پر نہیں گرا۔ اور یہ خیال کہ اس میں اشارہ قیامت کی طرف ہے اس لیے درست نہیں کہ قیامت میں آسمانوں کے انفطار، انشقاق وغیرہ کا ذکر تو ہے مگر آسمان کے زمین پر گرنے کا کہیں ذکر نہیں۔ جیسا کہ روح المعانی میں بھی تسلیم کیا ہے۔ پس یہاں سماء سے مراد مینہ ہے۔ اور جیسا کہ امام راغب نے قول نقل کیا ہے سماء کا لفظ بارش پر بالخصوص اس وقت بولا جاتا ہے [مَا لَمْ یَقَعْ عَلَى الْأَرْضِ] جب تک وہ زمین پر نہ گرے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کا مینہ کو روکنا کہ سوائے اس کی اجازت کے زمین پر نہ پڑے درحقیقت عظیم الشان اسباب رحمت الٰہی سے ہے۔ نہ صرف اس لیے کہ اگر اللہ تعالیٰ اسے نہ روکے اور اندازہ نہ اتارے تو وہی مینہ بجائے رحمت کے تباہی کا موجب ہوجاتا ہے۔ بلکہ اس لیے بھی کہ اس کے روکنے سے ہی وہ مختلف قطعات زمین پر پہنچتا ہے، ورنہ سمندر سے اُٹھ کر سمندر پر برس جائے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی لوگوں پر مہربانی اور رحمت ہے کہ کہاں سے اٹھا کر کہاں لاکر اسے برسنے کی اجازت دیتا ہے۔ سیاق مضمون بھی اسی معنی کو چاہتا ہے۔ اور یہاں ان تین باتوں کا ذکر اس لیے کیا کہ توحید پر یہ بھی دلائل ہیں کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے نہ دوسرے معبودوں نے۔

2243- **حقانیت توحید پر دلیل:** مَنْسَكٌ کے معنی عبادت یا عبادت کا طریق ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ساری دنیا کو اپنی نعمائے جسمانی سے بہرہ ور کیا ہے اسی طرح اپنی عبادت کا طریق بھی سب قوموں کو بتایا۔ جس طرح زمین سب کے لیے ہے، بارش بھی سب کے لیے ہے۔ اسی طرح طریق عبادت الٰہی بھی سب قوموں کو بتایا اور یہ مذہب توحید کی حقانیت پر کھلی دلیل ہے۔ کیونکہ مختلف قوموں اور مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کا طریق سکھانے والے

وَ اِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۸﴾

اور اگر تجھ سے جھگڑا کریں تو کہہ دے اللہ خوب جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔

اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۶۹﴾

اللہ تمہارے درمیان قیامت کے دن ان باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں تم اختلاف کرتے تھے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۷۰﴾

کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے یہ (سب کچھ) کتاب میں ہے۔ یہ اللہ پر آسان ہے۔

وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ مَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿۷۱﴾

اور اللہ کے سوائے اس کی عبادت کرتے ہیں جس کی اس نے کوئی سند نہیں اتاری اور جس کا انہیں کوئی علم نہیں اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ (2244)

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ؕ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ؕ

اور جب ان پر ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو تُو ان کے چہروں میں جو کافر ہیں انکار دیکھے گا۔ قریب ہے کہ ان پر حملہ کریں جو اُن پر ہماری آیتیں پڑھتے ہیں۔ کہہ، کیا میں

لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے الْاَمْرِ یعنی دین کے معاملہ میں جھگڑا کیسا۔ اور مطلب یہ ہے کہ تم ان جھگڑوں کی پرواہ نہ کرو اور دعوت الی اللہ میں لگے رہو۔

2244- شرک پر کوئی دلیل نہیں۔ یعنی توحید الٰہی پر تو ساری دنیا گواہ ہے۔ بایں ایک خدا کو چھوڑ کر کوئی مسیح کو خدا بناتا ہے، کوئی اہرمن کو، کوئی بتوں کو۔ حالانکہ ان میں سے کسی کے لیے اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نازل نہیں کی۔ کیونکہ کسی نبی پر یہ تعلیم نہیں اتری۔ پھر ان کے پاس اس کی کوئی علمی دلیل بھی نہیں۔ اور آخری بات یہ ہے ﴿مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ کی مدد جس پر انہیں بھروسہ ہے وہ بھی انہیں نہیں ملے گی۔ یعنی عملی طور پر کوئی ثبوت اس کا نہیں۔

قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ ؕ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۲﴾ ع 9 8 16

تمہیں اس سے بدتر (چیز) کی خبر دوں (وہ) آگ (ہے) اللہ نے اس کا وعدہ ان سے کیا ہے جو کافر ہیں۔ اور برا ٹھکانا ہے۔ (2245)

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَ اِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾

اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے سو اُسے سن رکھو، وہ جنہیں تم اللہ کے سوائے پکارتے ہو ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے، گو وہ سب اس کے لیے اکٹھے ہو جائیں۔ اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو اسے اس سے چھڑا نہیں سکتے۔ طالب اور مطلوب (دونوں) کمزور ہیں۔ (2246)

2245- ﴿يَسْطُوْنَ﴾۔ سَطوَۃ ہاتھ اٹھا کر پکڑنا ہے اور سَطَا بہ کے معنی ہیں اسے اس طرح پکڑا اور اصل میں سَطَا گھوڑے کی اگلی ٹانگیں اٹھا کر کھڑے ہو جانے کو کہا جاتا ہے۔ (غ)

﴿بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ﴾ یا اس سے بدتر میں اشارہ ان کے غیظ وغضب کی طرف ہے جس کی وجہ سے وہ داعی حق پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ تو فرمایا کہ تمہارے غیظ وغضب سے بدتر چیز وہ آگ ہے جو فی الحقیقت غیظ وغضب کا ہی نتیجہ ہے۔ اور یہ ان کا غیظ وغضب بھی اس بات پر دلیل ہے کہ ان کے ہاتھ میں دلیل کوئی نہیں۔

2246- يَسْلُبْ۔ سَلب غالب ہو کر کسی چیز کا دوسرے سے لے لینا۔ اور سَلب وہ چیز ہے جو اس طرح لے لی جائے۔ (غ)

طَالِبُ۔ مَطْلُوْبُ۔ طَلَب کسی چیز کے پانے کا اور اس کے لیے لینے کا قصد کرنا ہے۔ اور طَلَبَ بمعنی رَغِبَ بھی آتا ہے یعنی اس کی طرف مائل ہوا۔ (ل) اور یہاں طالب سے مراد معبود باطل اور مطلوب سے مراد مکھی بھی لی گئی ہے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ طالب سے مراد عبادت کرنے والا اور مطلوب سے مراد معبود ہے۔ جیسا کہ سدی، ضحاک وغیرہ سے مروی ہے۔ (د) اور طلب ایک چیز کی بھی ہوتی ہے اور معنی کے لحاظ سے بھی۔ ﴿فَمَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا﴾ [الكهف: 41:18] ''پھر تو اسے نکال نہ سکے۔'' (غ)

اس میں معبودان باطل کی کمال درجہ کی کمزوری دکھائی ہے کہ تمام دنیا میں جس قدر انسانوں یا دوسری چیزوں کو معبود مانا گیا ہے وہ سب کے سب مل کر بھی ایک مکھی نہیں بنا سکتے۔ بلکہ ان کی عاجزی کی یہی انتہا ہے کہ مکھی کوئی چیز ان سے چھین لے جائے تو وہ

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۷۴﴾

انہوں نے اللہ کو نہیں پہچانا (جس طرح) اس کے پہچاننے کا حق (تھا) یقیناً اللہ طاقتور غالب ہے۔

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۷۵﴾ۚ

اللہ فرشتوں میں سے رسول چنتا ہے، اور انسانوں میں سے۔ اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔(2247)

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۷۶﴾

وہ جانتا ہے جو اُن کے آگے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور اللہ کی طرف ہی سب کام لوٹائے جاتے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَ اسْجُدُوْا وَ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَ افْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۷۷﴾ۚ السجدة

السجدۃ عند الشافعی

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور نیک کام کرو، تاکہ تم کامیاب ہو۔

وَ جَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ۬ مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا

اور اللہ کی راہ میں کوشش کرو، جو اس کی (راہ میں) کوشش کا حق ہے، اس نے تمہیں چن لیا اور دین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی، تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب، اس نے تمہارا نام پہلے سے اور اس (قرآن)

اسے اس سے واپس نہیں لے سکتے۔ جب معبود کی کمزوری کی یہ حالت ہے تو عابد کی کمزوری کو خود سمجھ لو۔ اسی لیے فرمایا کہ طالب ومطلوب دونوں کمزور ہیں۔ اور یہاں بت مراد نہیں ہوتے، بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جنہیں خدا بنایا گیا ہے۔ جیسا کہ [آیت نمبر: 75] میں بتایا ہے۔ اس کمزوری کے ذکر میں یہ بھی سمجھا دیا کہ نہ پرستاران باطل اور نہ خود باطل حق کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

2247- یہاں فرشتوں اور انسانوں کے رسول بنانے کا ذکر مضمون توحید کے لحاظ سے ہی کیا ہے۔ کیونکہ انسانوں کو خدا بنایا گیا ہے۔ تو اس لیے فرمایا کہ انسان کی برگزیدگی کا بلند سے بلند مرتبہ رسالت ہے، اس سے اوپر کچھ نہیں۔ اور اس کی مخلوق تو فرشتے بھی ہیں۔ انہیں بھی وہ رسالت کا مرتبہ ہی دیتا ہے، خدائی کے حصہ دار وہ بھی نہیں ہوتے۔

لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۷۸﴾ ع 10 6 17

میں بھی مسلم رکھا۔ تاکہ رسول تمہارا پیشرو ہو اور تم لوگوں کے پیشرو بنو، سو نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو مضبوط پکڑو۔ وہ تمہارا آقا ہے، سو کیا ہی اچھا آقا ہے اور کیا ہی اچھا مددگار ہے۔ (2248)

2248- **مسلمانوں کو اعلائے کلمۃ اللہ پر پورا زور لگانے کی نصیحت:** شرک کی تردید کر کے اب مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے کہ وہ توحید پھیلانے کے لیے زور لگائیں۔ [آیت نمبر: 77] میں تکمیل نفس کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا نام پھیلانے میں وہی قوم کامیاب ہوسکتی ہے جو پہلے اصلاح نفس کرے۔ اس لیے اس آیت میں اصلاح نفس کا حکم دے کر اب فرمایا کہ اللہ کی راہ میں وہ کوشش کرو جو کوشش کا حق ہے، ادھوری اور ناتمام کوششیں کسی معمولی دنیوی امر میں بھی انسان کو کامیاب نہیں کرسکتیں، دین میں کس طرح کامیاب کریں۔ اور ﴿هُوَ اجْتَبٰىكُمْ﴾ میں بتایا کہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید پھیلانے کے لیے چن لیا اور رسولوں کے اصطفا مذکورہ آیت 75 کے مقابل امت مسلمہ کا اجتباء صاف بتاتا ہے کہ جو کام رسول کرتے تھے وہ اب اسی امت مسلمہ کے سپرد کیا گیا ہے۔ اور اس بات میں کہ اس نے یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کا نام مسلم رکھا پہلے بھی یعنی پہلی کتابوں میں بھی۔ اور ﴿فِيْ هٰذَا﴾ یعنی اس قرآن میں بھی اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ کامل فرمانبرداری ان کا شیوہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کا نام مسلم رکھا ہے۔ اور اس کی وجہ بھی خود ہی بتادی کہ تم لوگوں کے پیشرو یعنی معلم توحید بنو، جس طرح رسول تمہارا معلم توحید ہے۔ اس پر [دیکھو نمبر: 178]۔